SIECT
www.shibliinternational.com
July 2020
ISSN: 2581-9216

# ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد

## Urdu Monthly SADA E SHIBLI Hyderabad

ایڈیٹر مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

20/- روپے

جلد3:Vol_شمارہ Issue29

جولائی July :2020

ماہنامہ

حیدرآباد

# صدائے شبلی



**مدیر:** ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

**نائب مدیران:** ڈاکٹر سراج احمد انصاری ☆ ڈاکٹر عبدالقدوس ☆ ابوہریرہ یوسفی

**مجلس مشاورت:**

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، استاذ الاساتذہ حضرت رحمٰن جامی

پروفیسر مظفر علی شہ میری، پروفیسر محسن عثمانی ندوی

پروفیسر ابوالکلام پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی،

ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، مولانا ارشاد الحق مدنی،

مولانا محمد مساعد ہلال احیائی، اعجاز علی قریشی ایڈوکیٹ

محمد سلمان انجینئر

**مجلس ادارت:**

ڈاکٹر محمد رفیق، ڈاکٹر حمران احمد، ڈاکٹر جاوید کمال

ڈاکٹر مختار احمد فردین، ڈاکٹر غوثیہ بانو، ڈاکٹر سید امام

حبیب قادری، ڈاکٹر سمیہ تمکین، ڈاکٹر فاروق احمد بھٹ

ڈاکٹر محمد زبیر، ڈاکٹر مصطفیٰ خان، ڈاکٹر محمد فضیل ندوی،

ڈاکٹر مصلح الدین نظامی، ابوہریرہ ایوبی، محسن خان



قیمت فی شمارہ: 20

سالانہ: 220 -بیرونی ممالک: 50/امریکی ڈالر

خصوصی تعاون: 1000

MOHD MUHAMID HILAL
A/c: 52023475202 Bank: SBI
Ifsc: SBIN0020413
Micr: 500002311 Branch: Dabeerpura Hyd



ماہنامہ "صدائے شبلی" حیدرآباد میں مقالہ نگاران سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف حیدرآباد کی عدالت میں ہوگی



محمد محامد ہلال (اونر، پبلشر، پرنٹر، ایڈیٹر) نے دائرہ الیکٹرک پریس میں چھپوا کر حیدرآباد تلنگانہ سے شائع کیا



**خط و کتابت کا پتہ**

Email: sadaeshibli@gmail.com

Mob: 9392533661 - 8317692718

MOHD MUHAMID HILAL #17-6-352, B1, 2nd Floor,Bafana Complex,
Near Asfya Masjid Dabirpura Road, Purani Haveli,Hyderabad- 500023. T.S

# فہرست مضامین


| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱ | اپنی بات | ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی | ۵ |
| ۲ | اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم | علامہ شبلی نعمانیؒ | ۶ |
| ۳ | شبلی اور شعرالعجم | حقانی القاسمی | ۷ |
| ۴ | غزل | عبدالمنان صمدی | ۱۱ |
| ۵ | دیباچوں میں ذکر شبلی کا مطالعہ (قسط:۲۶) | ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی | ۱۲ |
| ۶ | ایمان بالآخرت | مولانا صدرالدین اصلاحی | ۱۶ |
| ۷ | حمید سہروردی اور بچوں کی کہانیاں | ڈاکٹر سید اسرارالحق سبیلی | ۱۸ |
| ۸ | غزل | رہبر پرتاپ گڑھی | ۲۱ |
| ۹ | مجتبیٰ حسین کی تحریر 'سلطان محمد قلی قطب شاہ کا سفرنامہ'..... | محبوب خان اصغر | ۲۲ |
| ۱۰ | اردو فکشن میں اودھ کی تہذیب وثقافت: قاضی عبدالستار..... | صدام حسین | ۲۶ |
| ۱۱ | غزل | ڈاکٹر عبدالحنان رہبر | ۳۲ |
| ۱۲ | تقدیر میں ہوتو.....(ناولٹ) | سیدہ زہرا جبین | ۳۳ |
| ۱۳ | بوڑھے والدین، معمر افراد اور اسلامی تعلیمات | وزیر احمد مصباحی | ۳۹ |



## ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کے خصوصی معاونین

**ابو سفیان** اعظمی، مقیم حال ممبئی.....الحاج **محمد منیرالدین عرف ولی**، آغاپورہ حیدرآباد

ڈاکٹر سید **جلیل حسین** ایم ڈی (علیگ) ٹولی چوکی حیدرآباد.....الحاج **محمد عبد الستار** سیکھ ویلج سکندرآباد حیدرآباد

**علی میاں احمد پٹھان** رائے گڑھ (مہاراشٹر).....**علی احمد عبد اللہ** کونچالی، رائے گڑھ (مہاراشٹر)

الحاج **رئیس احمد اقبال** انجینئر، سیکھ ویلج سکندرآباد حیدرآباد.....**محمد عبدالماجد** ایڈوکیٹ، سکندرآباد، حیدرآباد

جناب قاضی **فیض الدین**، اپر توڑیل، مہاڈ، رائے گڑھ مہاراشٹرا۔ ڈاکٹر **شہباز احمد**، پروفیسر گورنمنٹ نظامیہ طبی کالج چارمینار، حیدرآباد.....مولانا **محمد عبدالقادر سعود** نائس جوس سینٹر سکندرآباد، حیدرآباد۔

الحاج **محمد قمرالدین** نبیل کالونی بارکس حیدرآباد

# اپنی بات

پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا سے انتقال پر ملال کی اس قدر خبریں آرہی ہیں کہ دل مضطرب ہورہا ہے اور عوام ہیبت کا شکار ہوتے جارہی ہے، آئے دن ملک کی مشہور علمی، ادبی اور سماجی شخصیات داعی اجل کو لبیک کہہ رہیں۔ ایک شاعر کی زبان میں یہ سال گویا ایسا ہے ۔

عجب سال ہے، نہیں ایک پل بھی پُرسکون
لکھ لکھ کے تھک گئے انا للہ وانا الیہ راجعون

اللہ رب العزت تمام مرحومین کی مغفرت فرمائے اور قوم وملت کو اس کا نعم البدل عطا کرے۔

ایک مجرم بیس سال قبل پولیس اسٹیشن میں سیاسی شخص کو دن کے اجالے میں اور سب کے سامنے گولی مار کر قتل کر دیتا ہے اور اس پر چشم دید گواہوں نے گواہی سے فرار کا راستہ اختیار کیا اور وہ مجرم، ملزم بن کر رہا ہو گیا، جس کی وجہ سے مجرم مزید دلیر ہو گیا، لوگ اس کے شر سے بچنے کے لیے اس کی عزت کرنے لگے اور ذاتی مفاد کی تکمیل کے لیے، صحیح اور غلط پر سمجھوتہ کرنے لگے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے آٹھ پولیس والوں کو اپنے ہی گھر میں گولیوں سے بھون دیا۔ مجرم سے نرمی ہلاکت کے مترادف ہوتی ہے۔ یہ واقعہ اتر پردیش کے کانپور میں پیش آیا۔ مجرم قتل کرنے کے بعد فرار ہو گیا، اس کے بعد پولیس حرکت میں آئی، غصے میں اس قدر تھی کہ مجرم وکاس دوبے کے گھر کو ڈھادیا، املاک کو اپنی تحویل میں لے لیا اور گاڑیوں کو اسکراپ میں تبدیل کر دیا۔ پولیس کا یہ فعل اور کارروائی دستورِ ہند کے خلاف تھی، کیونکہ فرار مجرم کے گھر کی پہلے کُرکی ہوتی ہے، پولیس نے وکاس دوبے کی تلاش میں اس ٹکنالوجی کے دور میں کچھ زیادہ ہی وقت لگا دیا، اس دوران اس کے جو بھی ساتھی ہاتھ لگے، ان کا انکاؤنٹر کر دیا، حالانکہ انہیں قید کر کے مقدمے چلا کر کیفر کردار تک پہنچانا چاہئے تھا۔ وکاس دوبے اتر پردیش سے پاپ دھلنے کے لیے مدھیہ پردیش اجین کے مندر میں درشن کے لیے گیا، اس نے گرفتاری دی، یا گرفتار کیا گیا۔ ویڈیو میں دونوں کیفیت دکھائی دے رہی ہے۔ خیر مجرم پولیس کی قید میں تھا، اجین سے مجرم کو کانپور لایا جارہا تھا کہ کانپور کے قریب پولیس نے غلطی پر غلطی کرتے ہوئے وکاس دوبے کا انکاؤنٹر کر دیا، وکاس دوبے کا انکاؤنٹر تو ہو گیا، لیکن ساتھ ہی میں دستورِ ہند کی دھجیاں اڑ گئیں، کیونکہ مجرم کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، اس پر مقدمہ چلائے بغیر سزا نہیں دی جاسکتی اور مقدمات کے دوران حقیقت سے آگاہی ہوتی ہے اور اس معاملے میں نہ جانے کتنے سفید پوش اور خاکی پوش مجرم سامنے آجاتے، جو ملک سے غداری کر رہے تھے، مگر اس جذباتی یا پلاننگ انکاؤنٹر نے وہ پردے ڈالے ہیں، جو نہ صرف اتر پردیش کے لیے بلکہ تمام ملک کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگا۔

بابری مسجد کی شہادت اور اس پر ظالمانہ فیصلے کی گونج مسلمانوں کے دلوں میں پیوست ہی تھی کہ حیدرآباد میں تلنگانہ حکومت نے سکریٹریٹ کی دو مساجد کو بغیر کسی کے مشورے کے شہید کر دیا۔ ادارہ تلنگانہ حکومت سے گذارش کرتا ہے کہ جلد از جلد مقررہ جگہوں پر مساجد کی تعمیر کرائیں۔

**محمد محامد ہلال اعظمی**

# اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ شبلی نعمانیؒ

## عدل وانصاف:

عدل وانصاف کا سب سے نازک پہلو یہ ہے کہ خود اپنے مقابلہ میں بھی حق کا رشتہ چھوٹنے نہ پائے، ایک بار آپؐ مالِ غنیمت تقسیم فرمارہے تھے، لوگوں کا گردوپیش ہجوم تھا، ایک شخص آکر منہ کے بل آپؐ پر لد گیا، دست مبارک میں پتلی سی لکڑی تھی، آپؐ نے اس سے اس کو ٹھوکا دیا، اتفاق سے لکڑی کا سرا اس کے منہ میں لگ گیا اور خراش آگئی، فرمایا مجھ سے انتقام لے لو، اس نے عرض کیا یارسول اللہ میں نے معاف کردیا۔

مرض الموت میں آپؐ نے مجمع عام میں اعلان کیا کہ اگر میرے ذمہ کسی کا قرض آتا ہو، اگر میں نے کسی کی جان ومال یا آبرو کو صدمہ پہنچایا ہو، تو میری جان ومال وآبرو حاضر ہے، اسی دنیا میں وہ انتقام لے لے، مجمع میں سناٹا تھا، صرف ایک شخص نے چند درہم کا دعویٰ کیا جو دلوادیئے گئے۔

## جودوسخا:

جودوسخا آپؐ کی فطرت تھی، (ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ آپؐ تمام لوگوں سے زیادہ سخی تھے اور خصوصاً رمضان کے مہینہ میں آپؐ اور زیادہ سخاوت فرماتے تھے، تمام عمر کسی کے سوال پر ''نہیں'' کا لفظ نہیں فرمایا، فرماتے:

انما انا قاسم وخازن واللہ یعطی

''میں تو صرف دینے بانٹنے والا اور خازن ہوں اور دیتا اللہ ہے''۔

ایک دفعہ ایک شخص خدمت اقدس میں آیا اور دیکھا کہ دور تک آپؐ بکریوں کا ریوڑ پھیلا ہوا ہے، اس نے آپؐ سے درخواست کی اور آپؐ نے سب کی سب دے دیں، اس نے اپنے جاکر کہا کہ اسلام قبول کرلو، محمد (ﷺ) ایسے فیاض ہیں کہ مفلس ہوجانے کی پروا نہیں کرتے۔

ایک دفعہ ایک شخص نے کچھ مانگا آپؐ نے فرمایا، اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے، تم میرے ساتھ آؤ، حضرت عمرؓ بھی ساتھ تھے، عرض کی کہ آپؐ کے پاس کچھ موجود نہیں تو آپؐ پر کیا ذمہ داری ہے، ایک اور صاحب حاضر تھے، انہوں نے کہا یارسول اللہ! آپؐ دے جایئے اور عرش والے خدا سے نہ ڈریئے، وہ آپؐ کو محتاج نہ کرے گا، آپؐ فرطِ بشاشت سے مسکرادیئے۔

(عام فیاضی کا یہ حال تھا کہ جو شخص آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوتا، اگر آپؐ کے پاس کچھ سرمایہ موجود رہتا تو اس کو کچھ نہ کچھ ضرور عطا فرماتے، اس معمول کی بنا پر لوگ اس قدر دلیر ہوگئے تھے کہ ایک مرتبہ عین اقامتِ نماز کے وقت ایک بدو آیا، آپؐ کا دامن پکڑ کر کہا کہ میری ایک معمولی سی حاجت باقی رہ گئی ہے، خوف ہے کہ میں اس کو بھول نہ جاؤں، اس کو پورا کردیجئے، چنانچہ آپؐ اس کے ساتھ تشریف لے گئے اور اس کی حاجت برآری کرکے آئے تو نماز پڑھی۔

بعض اوقات ایسا ہوتا کہ ایک شخص سے ایک چیز خریدتے، قیمت چکادینے کے بعد پھر وہ چیز اس کو بطور عطیہ کے عنایت فرماتے، چنانچہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ سے ایک اونٹ خریدا اور پھر اسی وقت اس کو عبداللہ بن عمرؓ کو دے دیا۔ حضرت جابرؓ کے ساتھ بھی اس قسم کا ایک واقعہ مذکور ہے۔

**حقانی القاسمی**۔ جامعہ نگر، نئی دہلی

# شبلی اور شعرالعجم

حالی اور شبلی کی تنقید کا شجرہ نسب ایک ہے۔

مشرقی شعریات کا دونوں نے براہ راست غائر مطالعہ بھی کیا ہے اور ترجمہ کے وسیلے سے مغربی افکار و نظریات سے آشنا بھی تھے۔

اساسی فکریات میں اتحاد کے باوجود حالی اور شبلی کے نظریات نقد میں کچھ اختلافات اور فاصلے بھی ہیں۔ حالی کے نظریہ شعر کا محور ملٹن کا ایک مقولہ ہے جس پر بقول خلیل الرحمٰن اعظمی خود ملٹن بھی عمل پیرا نہ ہوا تو شبلی کے نظریہ شعر کی اساس ارسطو کا نظریہ تخیل و محاکات ہے۔ سادگی، اصلیت اور جوش حالی کے یہاں شعر کے عناصر ترکیبی ہیں تو شبلی محاکات اور تخیل کو اجزائے اصلی قرار دیتے ہیں۔ حالی کے یہاں معنی پر زور ہے تو شبلی بندش کی چستی اور انداز بیان کو اہمیت دیتے ہیں۔ حالی اپنے دیوان کے سرنامہ پر درمع الدھر کیف مادار لکھ کر زمانہ شناسی اور چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی بات کرتے ہیں تو شبلی جڑوں کی طرف واپسی پر زور دیتے ہوئے ماضی سے مکمل طور پر مربوط رہنے کی وکالت کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ 'مسلمانوں کی ترقی یہ ہے کہ پیچھے ہٹتے جائیں، پیچھے ہٹتے جائیں یہاں تک کہ صحابہ کی صف سے جا کے مل جائیں۔'

حال پیروی مغربی کی بات کرتے ہیں تو شبلی جادہ مغربیاں کو دل پذیر، دل آویز، دل آرا کہتے ہوئے اور مغربی فیوض و برکات کا اعتراف کرتے ہوئے مغرب کے ثقافتی تحفظات، تعصبات اور منفی ادراکات کا علمی استدراک بھی کرتے ہیں۔

حالی کا ذہن گلشن ہند کی خوشبو سے معطر ہے تو شبلی کے ساغر میں بادہ شیراز بھی ہے۔ حالی کی نثر سادہ اور شفاف ہے تو شبلی کی نثر میں جمالیاتی استدلالی کیفیت ہے۔

عرفان وادراک کی سطح پر ان فطری فاصلوں کے ساتھ حالی اور شبلی دونوں ہی ادب کے معمار اور ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دونوں ہمارا ماضی بھی ہیں اور مستقبل بھی—— اپنے عہد کی ترجیحات کے تناظر میں ہم انھیں حجت نہ بھی تسلیم کریں تب بھی شبلی اور حالی ہمارے حوالے میں شامل رہیں گے۔

حالی نے 'مقدمہ شعروشاعری' کی صورت میں اردو تنقید کو نقش اول عطا کیا تو شبلی نے 'موازنہ انیس و دبیر' لکھ کر تقابلی تنقید کی بنیاد رکھی اور 'شعرالعجم' سے عملی تنقید کی نئی راہ دکھائی۔

یہی 'شعرالعجم' میرا موضوع بحث ہے مگر اس سے پہلے شبلی کے نظام نقد کے حوالے سے چند ضمنی باتیں ضروری ہیں۔

شبلی مختلف شعبہ ہائے ذہن سے وابستہ تھے۔ وہ مورخ، فلسفی، سوانح نگار، سیرت نویس، معلم، فقیہ، محدث، شاعر و ناقد تھے۔ وہ ایسی بوقلموں اور متنوع شخصیت تھے جنھیں صاحب تاریخ ادب اردو نے کثیر الاشواق، جامع الاذواق اور مجموعہ کمالات مختلفہ قرار دیا ہے۔ عربی، فارسی کے علاوہ فرنچ زبان سے بھی واقف تھے۔ مختلف ملکوں کے فلسفوں، ثقافتوں اور تہذیبوں کی تاریخ سے آگاہ تھے۔ وہ Interculturally

competent تھے، مگر ان کی ذہنی مناسبت فلسفہ و تاریخ سے زیادہ تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ سرسید احمد خاں نے علی گڑھ کے زمانہ قیام میں انھیں صیغۂ تاریخ کا جنرل سکریٹری مقرر کیا تھا۔ ابن خلدون کے فلسفہ تاریخ نے انھیں مہمیز کیا اور اسی فلسفہ تاریخ کے وسیلے سے تنقید کے مختلف تصورات تک ان کی رسائی ہوئی۔

شبلی کی تنقید کے دائرے میں تاریخ، ثقافت، علم کلام اور دیگر علوم وفنون شامل ہیں۔ ان کی اصل تنقید تو الانتقاد علی المدن الاسلامی، الجزیہ، کتب خانہ اسکندریہ، اورنگ زیب عالم گیر کے ذریعہ تہذیبی کلامیہ کی صورت میں سامنے آئی جس کی توسیعی شکلیں ایڈورڈ سعید کی اورنٹلزم، ہومی بھابا کے سین، شن اور گائتری چکرورتی کے فلسفیانہ ڈسکورس میں نظر آتی ہیں۔

شبلی کا اصل میدان فلسفہ، تاریخ اور تہذیب کی تنقید ہے۔ شبلی کی تنقید کو ادبیات تک محدود نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں اس المیہ کا ذکر ضروری ہے کہ ہم نے تنقید کو ادب سے اس طرح مختص کر دیا ہے کہ تنقید خود گھٹن سی محسوس کرنے لگی ہے، جبکہ ادب کا معاملہ یہ ہے کہ ادب کا خود مختار، قائم بالذات، خود مکتفی وجود ہے ہی نہیں، یہ مکمل طور سے قائم بالذات ہے۔ ادب کا بنیادی انحصار نفسیات، سماجیات، لسانیات، تاریخ اور فلسفہ پر ہے اور ان ہی علوم وفنون سے ادب کو تنقیدی نظریات بھی میسر آتے ہیں۔ یونگ، فرائڈ ہوں یا ہرسل، سوسیور یا ژاک دریدا یا جان اسٹوارٹ مل، یہ سب بالترتیب نفسیات، لسانیات، تاریخ یا سیاسی اقتصادیات سے وابستہ ہیں، مگر یہ عجب تماشہ ہے کہ میر تقی میرؔ پر ایک معمولی مضمون لکھنے والا ہمارے ہاں ناقد کہلاتا ہے لیکن نیوٹن کے نظریہ پر نقد کرنے والا Critic نہیں بن پاتا۔ جبکہ تنقید کا دائرہ سائنسی، سماجی علوم کو بھی محیط ہے۔

شبلی نے اپنی تمام تنقیدی قوتوں اور بصیرتوں کا استعمال یورپ کے اس بیانیہ کو رد کرنے میں صرف کیا جس کی بنیاد اسنیلا اور جبر پر تھی۔ شبلی نے مغرب کے ثقافتی ادراک کو چیلنج کیا اور یورپ نے باقی دنیا سے جو ایک نموی سماجی ربط (Social Binary Relation) قائم کر رکھا تھا، اس سے لوگوں کو آشنا کیا اور مستشرقین کے اس تاثر کی تردید کی کہ مشرق وسطی میں مسلمان حکمرانوں نے صرف خلوت گہ خوباں اور شبستاں نگاراں کو آباد کر رکھا تھا، مغربی اور نوآبادیاتی انداز فکر کی مکمل مخالفت شبلی نے کی اور یوں بھی 1857ء میں جب شبلی پیدا ہوئے تھے تو اس وقت ہندوستانیوں کی حیثیت Subaltern جیسی ہوگئی تھی۔ نوآبادکار اپنے ثقافتی تشخصات کے تسلط کے لیے کوشاں تھے اور کچھ ارباب علم و دانش بھی نوآبادیاتی مقاصد اور مفادات کی تکمیل میں معاون ثابت ہو رہے تھے۔ ایسے وقت میں شبلی نے مشرق کے ثقافتی مظاہر کی نہ صرف تعبیر وتشریح کی بلکہ مشرق کی تاریخ وتہذیب کو ایک نیا تشخص عطا کیا۔

'شعرالعجم' اسی ثقافتی تشخص اور جستجو کا نتیجہ ہے مگر شعرالعجم شبلی کے تنقیدی ذہن وجہات کا صرف ایک ذیلی عنوان ہے۔

علامہ شبلی نعمانی شعرالعجم کے سبب تصنیف کے ذیل میں لکھتے ہیں:

> 'ایرانی ہمیشہ سے تہذیب، معاشرت اور علوم وفنون میں ممتاز رہے۔ اسلام نے ان کو ممتاز تر کر دیا۔ بوعلی سینا، غزالی، رازی، طوسی، امام بخاری، مسلم، سیبویہ، جوہری سب ایران ہی کی خاک سے اٹھے تھے۔ آج تمام اسلامی دنیا میں ایران ہی کی تہذیب ومعاشرت جاری ہے —— ایران کی خاک فنون لطیفہ کی قابلیت میں سب سے ممتاز تھی اور بالخصوص شاعری اس کا خمیر تھا۔ اسلام نے اس خاص

جوہر کو زیادہ چمکایا اور اس حد تک پہنچایا کہ تمام دنیا کی شاعری ایک طرف اور صرف ایران کی شاعری ایک طرف لیکن افسوس یہ ہے کہ آج تک کسی اسلامی زبان میں ایران کی شاعری کی کوئی ایسی تاریخ نہیں لکھی گئی جس سے ظاہر ہوتا کہ شاعری کب شروع ہوئی؟'

شعرالعجم کی تالیف کے پیچھے کچھ ایسے محرکات بھی ہوسکتے ہیں جس کا مقصد کچھ مفروضات اور مزعومات کی تردید ہو۔ مولانا حبیب خاں الرحمٰن شیروانی کی ایک تحریر سے اس نوع کا ایک اشارہ ملتا ہے جس میں انھوں نے ہماری بدمذاقی کا رونا روتے ہوئے کہا ہے کہ 'یہ بدمذاقی نہیں تو کیا ہے کہ ایک صدائے بازگشت کان میں پڑگئی کہ فارسی شاعری مضامین فطرت سے عاری ہے، اس میں بداخلاقی کے مضامین ہیں ہم میں بھی فونوگراف کی طرح ہی صدا بلند ہوگئی مگر ان فطرت پسندوں میں کتنے ہیں جنھوں نے فارسی شعر وسخن کے باقاعدہ مطالعے کے بعد یہ رائے قائم کی ہے۔'

شیروانی صاحب کا اشارہ صاف طور پر سمجھ میں آتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ فارسی شاعری کا جو مزاج ہے اسے اگر denotative meaning میں لیا جائے تو بات بداخلاقی کی سامنے آئے گی ہی، ہاں اگر connotative meaing کے تناظر میں فارسی شاعری کا تجزیہ کیا جائے تو پھر سارے اعتراضات رفع ہوجاتے ہیں۔

شبلی نے 'شعرالعجم' میں شعرائے سامانیہ، رابعہ، رودکی، عرفی، دقیقی، بلخی، خبازی، مروزی، عنصری، فرخی، فردوسی، طوسی، منوچہری، سنائی، عمرخیام، انوری، نظامی، عطار، اصفہانی، سعدی، امیر خسرو، سلمان ساوجی، حافظ شیرازی، ابن یمین، صنعانی، فیضی، عرفی، نظیری، طالب آملی، صائب اصفہانی، ابوطالب حکیم وغیرہ کے احوال واذکار سے صرف روشناس نہیں کرایا ہے بلکہ فارسی شعرا کے تخیل کی تہذیب، بدیع الاسلوبی، جدت ادا، لطافت خیال، جوش بیان اور ان سخنوروں کی قوت تخیل ومحاکات سے روبرو کرانے کی کوشش کی ہے اور اپنے نظریہ شعر، تخیل ومحاکات کے شعری شواہد پیش کیے ہیں۔ ابوطالب حکیم کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ اس کا ہر شعر قوت تخیل کا ایک منظر ہے۔ شاعر کو تمام عالم اور عالم کے تمام واقعات قوت تخیل کی وجہ سے ایک اور ہی صورت میں نظر آتے ہیں۔

شبلی بندش کی چستی پر بھی زور دیتے ہیں چنانچہ 'شعرالعجم' حصہ دوم میں حافظ شیرازی کے ضمن میں مشترک مضامین والے شعروں میں بندش کی چستی کی مثالیں دیتے ہوئے بتاتے ہیں کہ حسن کلام کا بڑا جوہر یہی حسن بندش ہے اور حافظ کا قول نقل کرتے ہیں کہ مضمون تو بازاریوں تک کو سوجھتے ہیں جو کچھ فرق اور امتیاز ہے۔ لطف اور بندش کا ہے۔ سیکڑوں مثالیں موجود ہیں کہ ایک مضمون کسی شاعر نے باندھا اور وہی مضمون دوسرے نے باندھا۔ الفاظ تک اکثر مشترک ہیں لیکن لفظوں کے الٹ پھیر اور ترتیب سے وہی مضمون کہاں سے پہنچ گیا۔

اس ضمن میں ایک مثال میر انیس اور دبیر کے یہاں سے پیش کی جاسکتی ہے۔ میر انیس کے مرتبے کا شعر ہے:

یہ تو نہیں کہا کہ شہ مشرقین ہوں
مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں

اسی کو دبیر نے یوں باندھا:

فرمایا میں حسین علیہ السلام ہوں

شبلی نے شعرالعجم میں شعرا کے امتیازات اور تفردات کے تعین کا ایک طریق کار بھی عطا کیا ہے۔ شعری متون کی روشنی

میں شاعری کے مضامین اور ممیزات طے کر کے ایک نئی راہ دکھائی ہے۔ اس طرح شعرالعجم عملی تنقید یا اطلاقی تنقید کی ایک روشن مثال ہے۔

عملی تنقید کے علاوہ شعرالعجم میں کچھ نظری مباحث بھی ہیں۔ چوتھی جلد میں شبلی نے شاعری کی حقیقت و ماہیت، شاعری کے مختلف عناصر مثلاً محاکات، تخیل، تشبیہ واستعارہ، جدت ولطف ادا، حسن الفاظ، الفاظ کے انواع واثر، الفاظ کی فصاحت وغرابت پر بحث کی ہے۔ مگر یہ شبلی کی ذہنی اختراع نہیں ہیں۔ ان میں زیادہ بحثیں وہ ہیں جو ارسطو اور جان اسٹیورٹ مل نے اپنے مضمون What is Poetry میں کہی ہیں۔ واضح رہے کہ ارسطو کا بنیادی میدان فلسفہ ہے تو مل بنیادی طور پر ایک فلسفی اور پالٹیکل اکنامسٹ ہیں اور یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ہم تک بیشتر تنقیدی تھیوری ثانوی ذرائع سے ہی پہنچی ہے۔ جدید تنقیدی تھیوریز کی رسائی بھی اسی طور پر ہوئی ہے۔ ژاک دریدا کا فلسفہ پس ساختیات (Post Astructularism) بھی ثانوی ذریعہ سے ہی پہنچا ہے کیونکہ دریدا ایک فرانسیسی دانشور ہیں، جن کی کتابیں فرنچ زبان میں ہیں۔ ان کی بیشتر کتابوں کے ترجمے انگریزی میں ہوئے۔ پس ساختیات کا نظریہ ہم تک گائتری چکرورتی کے ترجمہ Gramma Fology کے ذریعہ پہنچا ہے۔ اس لیے شبلی کے ان تصورات کو بھی ان کے بنیادی تصور کی حیثیت سے نہیں پرکھا جانا چاہیے۔ یہ مستعار اور مستفاد تنقیدی نظریات ہیں۔

شبلی نظریہ ساز Theorizer نہیں ہیں اور نہ ہی انھیں اس قسم کا کوئی ادعا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ 'شعرالعجم' نے ہماری تنقید کو نئے نشانات عطا کیے ہیں، نئی راہیں دکھائی ہیں۔ اس کے بعض مباحث سے آج کے جدید تنقیدی نظریات وتصورات کا رشتہ جڑ سکتا ہے۔ مرزا خلیل احمد بیگ نے شبلی کا تصور لفظ ومعنی پر بحث کرتے ہوئے 'شعرالعجم' میں فصاحت وبلاغت کے مسئلہ کو جدید اسلوبیات اور لسانیات سے جوڑ کر دیکھا ہے اور واضح طور پر یہ اعتراف کیا ہے کہ آج جدید لسانیات اور اسلوبیات کی روشنی میں اسلوب کی تشکیل وتوضیح کا جو کام جاری ہے اس کی جڑیں بلاشبہ 'شعرالعجم' میں تلاش کی جاسکتی ہیں۔

میرا تو ماننا ہے کہ مابعد جدید نظریہ کے عناصر کی جستجو بھی 'شعرالعجم' میں بہ آسانی کی جاسکتی ہے۔ خاص طور پر معنیات کی نفی کے نظام اور جدلیاتی وضع کی تلاش تو بالکل ہی دشوار نہیں ہے۔ تانیثی کلامیہ (فیمنسٹ ڈسکورس) کا مواد ہی شعرالعجم میں موجود ہے۔ فردوسی کے شاہنامہ میں تانیثیت کے نقوش موجود ہیں اور اس سے فیمنزم کو بہت روشنی مل سکتی ہے۔ کیونکہ بقول شبلی فردوسی پہلا شخص ہے اور پچھلا بھی جس نے اس مظلوم گروہ کی قدر کی ہے۔ ان کے رتبہ کو سمجھا ہے، ان کو بلند مرتبہ ثابت کیا ہے۔ شاہنامہ میں عورتیں مردوں کے ہمسر نظر آتی ہیں۔ بڑے بڑے مہمات میں ان کی رائے لی جاتی ہے۔ سلاطین کی طرف سے سفیر بن کر جاتی ہیں، شہزادے اور سلاطین ان سے مشورے لیتے ہیں۔ شاہنامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر مقامات پر عورت ہی کی حسن تدبیر نے مہمات کو سر کیا ہے جن عورتوں کو اتفاق سے تاج وتخت ہاتھ آیا ہے، انھوں نے نہایت قابلیت سے حکومت کے فرائض کو انجام دیا ہے۔

شاہنامہ کے جتنے بھی نسائی کردار ہیں ہما، رودابہ، دخت آفرید، مبشرہ، سب باکمال ہیں۔ ایثار ووفا، جرأت کی علامت، شبلی نے لکھا ہے کہ شاہنامہ کے مقابلہ میں ہومر کی ایلیڈ پر نظر ڈالو تو قصہ کی بنیاد ہیلن پر ہے۔ یونان اور ترکی کی وہ

سالہ قیامت انگیز جنگ اسی کی بدولت ہے لیکن وہ ایسی بدچلن عورت ہے کہ اپنے شوہر کو چھوڑ کر آشنا کے ساتھ نکل گئی۔ شاہنامہ میں صرف سودابہ ایک عورت ہے جس نے عصمت کو داغ لگانا چاہا لیکن فردوسی اس کو رستم کے ہاتھ سے قتل کرادیتا ہے کہ ایران کے دامن عزت پر داغ نہ آئے۔

شعرالعجم نظری اور عملی تنقید کے لیے ایک نشان راہ ہے اسی لیے مولانا اسلم جیراج پوری، حافظ محمود شیرانی کی سخت تنقیدوں کے باوجود یہ کتاب نہ صرف برصغیر ہندوپاک میں مقبول ہوئی، بلکہ اس کے چودہ ایڈیشن شائع ہوئے۔ ایران اور افغانستان میں بھی اسے بے پناہ مقبولیت اور حوالہ جاتی حیثیت حاصل ہوئی۔ محمد تقی فخر داعی گیلانی نے فارسی میں اس کا ترجمہ کیا۔ لٹریری ہسٹری آف پرشیا کے مصنف براؤن نے بھی اس کی ستائش کی۔ پروفیسر امیر حسن عابدی نے لکھا کہ علامہ شبلی کو یہ اولیت حاصل ہے کہ سب سے پہلے انھوں نے فارسی شاعری کو انتقادی نظر سے دیکھا۔

مہدی افادی نے اعتراف کیا ہے کہ 'شعرالعجم' تنقید عالیہ کا بہتر سے بہتر نمونہ ہے، جس پر دنیا کی کوئی بھی زبان ناز کرسکتی ہے۔

یقیناً 'شعرالعجم' ایک مایہ ناز کتاب ہے جو وجود میں نہ آتی تو شاید ہم تخیل کی اس تہذیب سے آشنا نہ ہوپاتے جو صرف ایران سے مخصوص ہے۔ شعرالعجم کی خوش نصیبی ہے کہ یہ ابھی تک ناقدین کے ذہن کا محور بنی ہوئی ہے مگر اس کی اور حالی کے 'مقدمہ شعروشاعری' دونوں کی بدنصیبی یہ ہے کہ یہ شاعروں کی نگاہوں کا مرکز نہیں بن پائیں۔ جبکہ اصلاً یہ دونوں کتابیں شاعری کے لیے ہدایت نامہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ حالی نے اپنی شاعری کا تنقیدی جواز پیش کرنے کے لیے 'مقدمہ شعر' لکھا تھا اور شاعروں کے لیے اس میں پندوموعظت کے انبار بھی لگائے تھے۔ ان دونوں کتابوں کے بنیادی مسائل و مباحث کا رشتہ ناقدین سے زیادہ شاعروں سے ہے اور المیہ یہ ہے کہ یہی طبقہ اسے درخور اعتنا نہیں سمجھ رہا ہے۔ اس تعلق سے حالی اور شبلی کو شاعروں سے شکایت ہونی چاہیے مگر ناقدین کو بھی حالی اور شبلی سے یہ شکوہ ہے کہ ان دونوں نے اصناف نثر کو درخور اعتنا نہ سمجھا اور نقد شعر کی طرح نقد نثر کی کوئی بنیاد نہیں رکھی۔

**عبد المنان صمدی**۔ علی گڑھ

# غزل

ایسے بدل رہی ہے تقدیر دھیرے دھیرے
کاتب کی جیسے بدلے تحریر دھیرے دھیرے

احساس ہی نہیں ہے زنداں کا اس کو یارو
اس پر کھلے گی کیسے زنجیر دھیرے دھیرے

الفاظ میرے سادہ لہجہ بھی عام سا ہے
میرے سخن میں ہوگی تاثیر دھیرے دھیرے

میں نے لکیر کھینچی کاغذ پہ اس طرح سے
بنتی چلی گء اک تصویر دھیرے دھیرے

جب سے گیا ہے مجھ کو وہ چھوڑکر اکیلا
تب سے ہی چھب رہا ہے اک تیر دھیرے دھیرے

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔ 9838573645

# دیباچوں میں ذکر شبلی کا مطالعہ

## خالد بزمی

پروفیسر محمد یونس خالد بزمی (۱۹۳۲ء۔ ۱۹۹۹ء) اسلامیہ کالج لاہور کی طالب علمی کے زمانہ میں شبلی کے شیدائی تھے۔ کالج کے ترجمان مجلّہ کریسنٹ کا شبلی نمبر انھیں نے ترتیب دیا ہے، اس کے حرف آغاز میں لکھا ہے کہ:

''علامہ شبلی کے دل میں اسلام اور ملت اسلامیہ کے لئے جو درد اور جوش وجذبہ تھا اس کی مثالیں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ مشاہیر اسلام میں انھیں نہایت با عزت اور قابل افتخار و نازش مقام نصیب ہے۔ اپنے اخلاق واوصاف اور خدمات کے اعتبار سے وہ زیادہ سے زیادہ اظہار عقیدت اور سپاس وتحسین کے حق دار ہیں''۔ (حرف آغاز کریسنٹ شبلی نمبر، لاہور، جنوری ۱۹۷۱ء)

## ڈاکٹر عابد رضا بیدار

ڈاکٹر عابد رضا بیدار (پ: ۴؍فروری ۱۹۳۴ء) ممتاز اہل قلم ہیں، ان کے قلم سے کئی کتابیں نکلیں، لیکن ان کا بڑا کارنامہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کی ڈائرکٹر شپ کے زمانہ میں کتابوں کی ترتیب وتدوین واشاعت ہے۔ اس لحاظ سے انھوں نے علم وادب کی جو خدمات انجام دیں وہ ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ سرسید تقریبات کے تحت انھوں نے علامہ شبلی کی فارسی غزلوں کا مجموعہ ''غزلیات شبلی'' کے نام سے ۱۹۹۵ء میں شائع کیا اور حرفے چند کے عنوان سے اس کی اشاعت کے اسباب بیان کئے اور آخر میں لکھا ہے کہ:

''غزلوں کے بارے میں اتنا کہنا کافی ہوگا کہ جب کبھی عہد اخیر میں ہندوستان میں فارسی زبان کے ان اہم ترین غزل گویوں کی بات چھڑے گی جو ایران میں بھی لطف وانبساط کے ساتھ پڑھے جاسکیں اور وہی مسرت وبصیرت بخش سکیں تو اس اٹوٹ تثلیث غالب، شبلی اور اقبال کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکے گا''۔

ایک بات یہ کہہ دینی ضروری ہے کہ غزلوں کے علاوہ شبلی نے قصیدے بھی لکھے، مثنویاں بھی، قطعے بھی، رباعیاں بھی، لیکن سب کچھ دیوان کی ہیئت مکمل کرنے کے لئے، کچھ ضرورت وقت کے لئے، کچھ بہ پاس خاطر دوستاں، کچھ یوں کچھ یوں، مگر دل کی باتیں، دل کی زبان میں انھوں نے صرف غزل میں کہی ہیں، جس میں ان کی شاعری کا نقطہ عروج مل جاتا ہے۔ بلکہ صاف صاف یہ کیوں نہ کہیں کہ شبلی نے اگر فارسی میں شاعری کی ہے تو بس غزلوں ہی میں''۔ (غزلیات شبلی ص ۴)

## ڈاکٹر خلیق انجم

انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری مرحوم ڈاکٹر خلیق انجم (۱۹۳۵۔ ۲۰۱۶ء) کا شمار ہمارے عہد کے نامور اہل قلم، محقق، نقاد اور دانشوروں میں ہوتا ہے۔ بلا شبہہ انھوں نے پوری زندگی اردو ادب کی خدمت کی۔ ان کے قلم سے مختلف موضوعات پر پچاس سے زائد کتابیں نکلیں، کئی رسائل کے وہ برسوں مدیر رہے، متنوع موضوعات پر سیکڑوں مقالے لکھے۔

متعدد کتابیں ایڈٹ کر کے شائع کرائیں، ان میں غالب کے خطوط اور آثار الصنادید کی ترتیب وتدوین میں انھوں نے جو کاوش کی ہے اسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے وہ علامہ شبلی اور مولوی عبدالحق کے جانشین تھے، غالباً اسی وجہ سے انھوں نے انجمن کی طرف سے ان پر سمینار منعقد کئے۔ شبلی پر انجمن کا سمینار ۱۹۹۵ء میں ہوا تھا جس میں ملک کے تقریباً تمام نامور اہل قلم شریک ہوئے تھے، انجمن نے ان مقالات کا انتخاب ''شبلی کی علمی وادبی خدمات'' کے عنوان سے شائع کیا ہے، اس کا دیباچہ ڈاکٹر خلیق انجم نے لکھا ہے، اس کا آغاز اس طرح ہوا ہے:

''۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے بعد ظہور میں آنے والے علمی اور ادبی منظر نامہ میں علامہ شبلی نعمانی کی بہت نمایاں اور ممتاز شخصیت تھی۔

کثیر الجہات شخصیت کے حامل اس عالم کو عربی وفارسی پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ وہ ان دونوں میں بے تکلف نظم ونثر لکھنے پر قادر تھے۔ فرانسیسی زبان میں بھی انھیں تھوڑی بہت شدبد حاصل تھی۔ اردو تو خیر ان کی مادری زبان ہی تھی''۔ (شبلی کی علمی وادبی خدمات ص۹)

اس کے بعد ڈاکٹر خلیق انجم نے شبلی کی تعلیم، اس میں مہارت اور ان کے اساتذہ کا ذکر کیا ہے۔ اس میں انھوں نے مولانا عبدالحی فرنگی محلی کو بھی ان کا استاذ لکھا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ پھر انھوں نے علی گڑھ کالج سے وابستگی سرسید سے تعلق، افادہ واستفادہ کی تفصیل لکھی ہے، بعد ازاں علامہ شبلی کے ذوق مطالعہ پر روشنی ڈالی ہے اور لکھا ہے کہ:

''سرسید کا کتب خانہ بہت اچھا تھا جس میں مختلف زبانوں اور خاص طور سے عربی اور فارسی کی نایات اور نادر کتابیں تھیں، تاریخ جغرافیہ اور عربی کی بہت سی کتابیں ایسی تھیں جو جرمنی میں چھپی تھیں اور ہندوستانی علما جن کے نام سے بھی واقف نہیں تھے۔ جب سرسید کو معلوم ہوا کہ شبلی کو مطالعہ کا بہت شوق ہے تو انھوں نے شبلی کو اپنی لائبریری سے استفادے کی اجازت دے دی، کہتے ہیں کہ شبلی کا بیشتر وقت اس لائبریری کی کتابوں کے مطالعہ کرنے میں صرف ہوتا۔ جب سرسید کا انتقال ہوا تو کتب خانہ کی چابی شبلی کے پاس تھی''۔ (ایضاص۱۰)

سرسید کے بعد شبلی پروفیسر آرنلڈ سے متاثر ہوئے، تاریخ اور جدید علوم اور سائنٹفک انداز تحقیق علامہ شبلی نے انھیں سے سیکھا، سیرۃ نبوی پر بدء الاسلام سرسید کی فرمائش پر لکھی، جو عرصہ تک کالج کے نصاب میں شامل رہی، ڈاکٹر خلیق انجم نے یہ تمام تفصیلات پیش کرنے کے بعد ادبی تحقیق وتنقید اور شعر العجم پر اظہار کیا ہے اور یہاں تک لکھا ہے کہ:

''اس کتاب میں ادبی تحقیق کے اعلا ترین نمونے موجود ہیں اور مختلف مقامات پر شبلی نے اپنے تنقیدی نظریات بیان کئے ہیں۔ اگر ان تمام نظریات کو شعر العجم سے نکال کر ایک علاحدہ کتاب کی صورت میں مرتب کر دیا جائے تو یہ کتاب مولانا الطاف حسین حالی کی مقدمہ شعر وشاعری سے زیادہ بہتر ثابت ہوگی۔ شبلی کی موازنہ انیس ودبیر آج بھی عملی تنقید کا بہترین نمونہ ہے۔ شبلی کی تنقیدی تحریریں اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ ان کی تنقیدی بصیرت میں مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی سے زیادہ توانائی، گہرائی اور گیرائی ہے''۔ (ایضاص۱۱)

۱۸۹۲ء میں علامہ شبلی نے روم ومصر وشام کا سفر کیا،

وہاں کتب خانوں کا جائزہ لیا، مطالعہ کیا، نوٹس لئے، اسکول، کالج اور مدارس کا معائنہ کیا، تعلیم، طریقہ تعلیم اور نصاب تعلیم کو خاص طور پر دیکھا اور سفرنامہ میں اس کی تفصیل سپرد قلم کی، سفرنامے کے لحاظ سے اس میں بعض کمیاں ضرور رہیں مگر تعلیمی اور علمی لحاظ سے یہ ایک منفرد سفرنامہ ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے یہ تمام تفصیلات پیش کرنے کے بعد اسے تاریخ اور ادب کا قابل قدر سرمایہ بتایا ہے اور لکھا ہے کہ:

''شام وروم کے اس سفر نے شبلی میں ایک ذہنی انقلاب پیدا کردیا، انھوں نے جن چیزوں کے بارے میں پڑھا یا سنا تھا اب انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا موقع ملا۔ مغربی ممالک مسلمانوں سے صدیوں پہلے کے واقعات کا جس طرح انتقام لے رہے تھے اس کا شبلی کو بہت افسوس ہوا، انھوں نے ترکوں اور عربوں کے تعلیمی نظام کا جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہونچے کہ اگر یہی نصاب اور طریقہ تعلیم جاری رہا تو مسلم قومیں کبھی سر نہ اٹھا سکیں گی۔

انھیں اس سفر کے دوران جو احساس ہوا اور انھوں نے جو فیصلہ کیا اس کی عملی شکل ندوۃ العلما میں نظر آئی''۔ (ایضاص ۱۲)

ڈاکٹر خلیق انجم نے سرسید اور شبلی کے تعلقات اور دونوں کے خیالات کی بھی وضاحت کی ہے، وہ شبلی کی علی گڑھ کالج سے وابستگی کو ان کی خوش نصیبی سے تعبیر کرتے ہیں اور پھر اسی کو ان کی بدنصیبی کا سبب بھی قرار دیتے ہیں، ان کا یہ بھی خیال ہے کہ شبلی سرسید سے بہت متاثر تھے اور ان کی بہت سی خوبیوں کے معترف بھی، مگر سیاست اور تعلیم میں ان سے اختلاف تھا، پھر لکھتے ہیں:

''شبلی کا یہ خیال بالکل صحیح تھا، سرسید کی جدید تعلیم نے نوجوانوں کو مذہب، تہذیب اور تاریخ سے بالکل بے بہرہ کر دیا تھا۔ شبلی کا عقیدہ تھا کہ نوجوانوں کو ایسے نصاب کی ضرورت ہے جس کے ذریعہ جدید اور قدیم دونوں انداز کی تعلیم دی جاسکے''۔ (ایضاص ۱۳)

علامہ شبلی نے قدیم صالح اور جدید نافع کے حصول کا نظریہ پیش کیا اور وہ اسی پر کاربند رہے مگر ان کے اس نقطہ نظر سے اختلاف کیا گیا اور قدیم وجدید دونوں مکتبہ فکر کی طرف سے اعتراضات ہوئے۔ ڈاکٹر خلیق انجم اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شبلی جدید وقدیم اور علی گڑھ وندوۃ العلما کے طرف داروں کے تعصبات کا شکار ہوگئے۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے غالباً پہلی بار شبلی کو سرسید کا ترجمان ثابت کرنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے بحث ومباحثہ کے دروازے کھل گئے اور بہت سے ادیبوں نے اس آگ کو ہوا دی جن میں مولانا سید سلیمان ندوی، شیخ اکرام، اقبال احمد سہیل، مولانا عبد السلام، ڈاکٹر سید عبداللہ، مولوی بشیر الدین وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ شبلی کے موافقین اور مخالفین دونوں نے ان کی علمی، مذہبی اور ادبی فتوحات کا منصفانہ جائزہ لینے کے بجائے مشرق ومغرب، علی گڑھ اور ندوہ، سرسید اور شبلی کے اختلافات جیسے موضوعات پر تفصیل سے بحث کی اور ایک دوسرے پر الزام تراشی اور الزامات کے جواب دینے پر اپنی تمام صلاحیتوں اور شبلی کی عظمت کو قربان کردیا۔'' (ایضاص ۱۳)

ڈاکٹر خلیق انجم نے تنقید شعرالعجم کو منفی تحقیق اور منفی تنقید

کا نمونہ قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''مولوی عبدالحق حالی کے مداح بلکہ معتقد تھے، حالی اور شبلی میں اختلافات تھے۔ مولوی صاحب نے حالی کی حمایت کا یہ طریقہ نکالا کہ حافظ محمود شیرانی سے شبلی کی شعرالعجم پر مضامین لکھوائے جو اردو میں منفی تحقیق اور منفی تنقید کا پہلا نمونہ تھے۔ یہ مضامین پہلے تو انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالہ اردو میں شائع کئے گئے اور پھر انھیں کتابی صورت میں چھاپا گیا، ان مضامین نے وقتی طور پر شبلی کے ادبی مرتبے کو متاثر کیا''۔ (ایضاص ۱۳)

ڈاکٹر خلیق انجم کی یہ رائے کہ حالی و شبلی میں اختلافات تھے درست نہیں ہے، شبلی نے حیات جاوید پر تنقید حالی سے اختلاف کی بنیاد پر نہیں کی تھی بلکہ اس میں سرسید کی کھنچی ہوئی تصویر انھیں پسند نہ تھی۔ حالی و شبلی میں آخر تک اچھے تعلقات استوار رہے اور خط و کتابت بھی رہی۔

علامہ شبلی کی شخصیت اور ان کے بعض خیالات پر جو تنقیدیں ہوئیں اور جو اعتراضات ہوئے ڈاکٹر خلیق انجم نے ان کا بھی ذکر کیا ہے، مولوی عبدالحق کے مقدمہ خطوط شبلی کو جارحانہ رویہ قرار دیا ہے۔ اسی طرح ان پر ذاتی حملوں کو شر پسندی سے تعبیر کیا ہے اور اپنے شبلی کی عصری معنویت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''شبلی اور ان کے معاصر مخالفین کو گذرے مدت ہو چکی ہے۔ اب آہستہ آہستہ شبلی کی عظمت کا احساس عام ہونے لگا ہے، نئی نسل شبلی کو ان کے معاصرین کے بیانات کی روشنی میں سمجھنے کے بجائے خود ان کی تصنیفات اور ان کے علمی اور ادبی کارناموں کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے، اس لئے شبلی کی علمیت، عقل پسندی، روشن فکری، آزاد خیالی، وسعت نظر اور دانشوری کا اعتراف عام ہوتا جا رہا ہے۔ پروفیسر عالم خوندمیری کا یہ خیال قابل غور ہے کہ شبلی ہماری تہذیبی میراث کا حصہ بن گئے ہیں۔ شبلی کے ایک وارث ابو الکلام آزاد ہیں اور دوسرے وارث علامہ اقبال۔..... شبلی نے صرف آزاد اور اقبال ہی کو متاثر نہیں کیا بلکہ ان کی تصنیفات نے کئی نسلوں کی ذہنی تربیت کی ہے''۔ (ایضاص ۱۴)

علامہ شبلی کی سیاسی فکر سرسید سے قدرے مختلف تھی اور وہ سرسید کے ساتھ رہتے ہوئے بھی تھی اور سرسید کی وفات کے بعد بلکہ اخیر تک رہی۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنے دیباچے میں اس پر بھی اظہار خیال کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''شبلی کی شخصیت کا ایک حیرت انگیز پہلو یہ تھا کہ وہ خاصی مدت تک اس علی گڑھ میں رہے جو برطانوی حکومت کا پرستار تھا، ان سرسید کے ساتھ رہے جو انگریزوں کو اپنی قوم کا نجات دہندہ سمجھتے تھے اور کانگریس میں مسلمانوں کی شمولیت کے سخت خلاف تھے، اس سب کے باوجود شبلی پہلے ہندوستانی عالم ہیں جنھوں نے انگریزوں کے خلاف آواز بلند کی۔ وہ کانگریس میں مسلمانوں کی شمولیت اور ہندوستان کی آزادی کے حق میں تھے۔ اس کا پورا امکان ہے کہ جنگ آزادی کے سب سے بڑے مسلم مجاہد مولانا ابوالکلام آزاد کو یہ راستہ شبلی کے انداز فکر ہی نے دکھایا ہو، لیکن یہ امر تحقیق طلب ہے''۔ (ایضاص ۱۴۔۱۵)

مولانا صدرالدین اصلاحی (حیدرآباد)

# ایمان بالآخرت

یہاں آخر میں چل کر ذہن کے اندر قدرتی طور پر سوال ابھرتا ہے اور وہ یہ کہ پہلا گروہ تو کھلم کھلا منکرین قیامت کا گروہ تھا، اس لیے کہ اس کو اپنے بارے میں یہی لقب پسند تھا اور اس نے دنیا کے سامنے اپنے کو اس حیثیت سے پیش کیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کا دل قطعی طور پر منکر نہ تھا بلکہ فی الواقع متردد تھا، لیکن اس دوسرے گروہ کی پوزیشن کیا ہے؟ جبکہ زبان کی حد تک اسے اپنے عقیدۂ آخرت پر شدت سے اصرار ہے؟ بلاشبہ دنیا کا قاضی، جو دلوں کا حال نہیں جانتا ایسوں کو ہرگز منکرِ آخرت نہیں قرار دے سکتا، لیکن کیا یومِ جزاء کا قاضی بھی یوں ہی فیصلہ کرے گا؟ قرآن کہتا ہے کہ نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ یہ قاضی ایسوں کے بارے میں کل جو کچھ فیصلہ کرنے والا ہے، اس کا حال تو کل ہی کھولے گا، لیکن اس دنیا میں بھی اس کا فیصلہ کچھ زیادہ چھپا ہوا نہیں ہے۔ اس کے کلام قرآن مجید میں جو تنقیدیں ان اسرائیلیوں کے اعمال وافکار پر کی گئی ہیں، ان کے اندر صاف طور سے اس امر کی غمازی موجود ہے کہ ان کو آخرت پر یقین نہیں اور میزان حقیقت میں ان کے زبانی اقرار کا پلڑا انکار کے پلڑے سے کسی طرح بھی جھکا ہوا نہیں ہے۔ قرآن کے پہلے ہی صفحہ پر نظر ڈالیے سورۂ بقرہ کی جس کا مخاطب یہودی کی طرف ہے، ابتدائی آیتیں آپ کے سامنے ہوں گی، ان آیتوں میں اس امر کا دعویٰ کیا گیا ہے کہ جس آخری تکاب اور نبوت کا تورات اور انجیل میں وعدہ کیا گیا تھا، وعدہ نہیں بلکہ جس کی بشارت دی گئی تھی اور جس کے ظہور کے تم سراپا شوق اور ہمہ تن انکار تھے، وہ یہی کتاب (قرآن) ہے، اس میں ذرہ برابر شک کی گنجائش نہیں۔ رہی یہ بات کہ تم باوجود شوق وبے تابی کے اس پر ایمان کیوں نہیں لاتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان کی دولت ایمان کے قدردانوں اور مستحقوں ہی کو ملتی ہے۔ یہ مستحق وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے دلوں میں تقویٰ ہو اور تقویٰ کی کچھ لازمی صفات وعلامات ہیں۔ پھر یہ صفات گنائی گئی ہیں اور سب سے آخری صفت جسے بند کا مقطع کہنا چاہئے یہ بیان کی گئی ہے کہ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ "یعنی متقی قرآن کی ہدایت پاسکنے والے وہ لوگ ہوتے ہیں جن کو آخرت پر بھی گہرا یقین ہو" ادب عربی کا معمولی اداشناس بھی جانتا ہے کہ بِالْاٰخِرَةِ کے لفظ کا مقدم ہونا اور هُمْ کی ضمیر کا لانا کیا معنی رکھتا ہے۔ دراصل اس جملہ میں یہودویں کے ادعائے ایمان بالآخرت کو نہ تسلیم کرتے ہوئے اس کے کھو کھلے پن پر کھلی تعریض کی گئی ہے اور ان کے اس ام الامراض کی طرف انگلی اٹھادی گئی ہے جو ہدایت قرآنی سے ان کی محرومی کا اصل سبب ہے، اسی طرح اس سورہ میں چند صفحہ آگے چل کر جہاں ان کو براہِ راست خطاب کر کے قرآن پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا گیا ہے، انہیں یہ وصیت فرمائی گئی ہے کہ "راہ اللہ پرستی طے کرنے کے لیے نماز اور صبر کا۔۔۔۔۔۔۔۔۔سفر ساتھ لے لو، بلاشبہ منزل مقصود پر پہنچ جاؤ گے۔ مگر بات اتنے پر ہی ختم نہیں کردی گئی ہے بلکہ یہ بھی کہنا ضروری سمجھا گیا کہ "یقیناً یہ نماز بہت شاق ہوتی، سوائے ان لوگوں کے جو دل میں اللہ تعالیٰ پر خشوع رکھتے ہیں، جنہیں اس امر کا یقین ہے کہ ایک دن اپنے رب سے ضرور دوچار ہونا پڑے گا"۔ اس جملہ کا حقیقی ز ور آپ پر اسی وقت واضح ہوگا جب ان کی یہ حالت بھی آپ کے سامنے ہو" کہ ان یہودیوں نے نماز ضائع کردی اور اپنی لگام شہوات نفس کے ہاتھوں میں دے رکھی ہے" دونوں آیتوں کو ایک ساتھ رکھ کر دیکھئے، نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ نکلے گا کہ قرآن یہ تسلیم کرنے کے لیے

تیار نہیں ہے کہ وہ آخرت یعنی مکافاتِ عمل کا یقین اور اندیشہ رکھتے ہیں، کیونکہ ان کی زندگی کا سارا رویہ آخرت کے منکروں کا سا ہے اور اپنے اندر ان کے زبانی دعوے کی صداقت پر کوئی ایک بھی وزنی دلیل نہیں رکھتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن انہیں بار بار جھنجھوڑتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہارے سینے اللہ کے خوف سے کیوں خالی ہوگئے ہیں؟ کیوں نہیں ایسا ہوتا کہ تم آخرت کی فکر کرو وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ (الخ) دنیا کے خوف اور لالچ سے تو تمہارے دل اٹے پڑے ہیں، لیکن اللہ کی دہشت اور محبت کا ان میں کوئی گذر نہیں، حالانکہ خوف مجھ سے اور صرف مجھے ہی سے کھانا چاہئے تھا وَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ

اس سلسلے میں یہ بات حیرت اور افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ اللہ کے ان لاڈلوں اور جنت کے ان اجارہ داروں نے آخرش ایمان بالآخرت کی بہ ظاہری نمود بھی نہ باقی رہنے دی اور ان کے دست تحریف نے نہ جانے کب اس نام نہاد عقیدۂ آخرت کے خیالی اندیشوں سے بھی ان کے دماغوں کو مطمئن کردینے کی کوشش کر ڈالی، یعنی اس وقت جو تورات ہمارے سامنے موجود ہے، اس میں اس اہم ترین بنائے دین کی واضح تعلیم سرے سے ملتی ہی نہیں۔

اپنے حالات کا جائزہ

گذشتہ مباحث میں ہم دوسری اساس دین (ایمان بالآخرت) کے متعلق چند باتیں اچھی طرح جان چکے ہیں، یعنی یہ کہ اس کی اصل اور حقیقت کیا ہے؟ تعمیر دین میں وہ کس اہمیت کی مالک ہے؟ اس سے بے نیازی کے اسباب ومحرکات کیا ہیں؟ اور اتنی بڑی دہشت آفرین چیز سے جانتے بوجھتے نفس کا کونسا فریب کھا کر انسان بے فکر ہوجاتا ہے؟ پھر اس فریب نظر کی واقعاتی شہادت کے لیے بنی اسرائیل کے افکار واعمال کی تاریخ بھی سامنے لائی جاچکی ہے۔ بحث کے نظری پہلو کا تقاضہ ہے کہ اب آگے بڑھا جائے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے کہ اس بنیاد کی تعمیر کیسے ہوا کرتی ہے؟ اور اگر کہیں وہ کمزور حالت میں موجود ہو تو اُسے مضبوط بنانے کی کیا تدبیر کی جائے؟ مگر اپنی حالت مجبور کرتی ہے کہ اس کا بھی جائزہ لے لیا جائے اور بنی اسرائیل کی داستان حیرت سن کر غیر محسوس طور پر اپنی پاکدامنی کا جو پندار ہوگیا ہے یا کم از کم یہ کہ ہونے کا اندیشہ ہے، اس کی قدر و قیمت بھی پرکھ لی جائے یا اگر کچھ حساس اور غیرت پذیر دماغوں میں اس طرح کے غلط پندار کی جائے اپنی زبوں حالی کا شور بھی ابھر آیا ہو تو ان کو بھی صورت واقعہ کا پورا پورا مشاہدہ کرادیا جائے اور ''حدیثِ دلبراں'' ''سر دیگراں'' کے پردوں میں چھپی نہ رہ جائے ورنہ اس کے بغیر شاید ان سطروں کا مقصود ہاتھ نہیں آسکتا، اس لیے یہ فیصلہ سنے بغیر کہ بحث کا سیاق اس جائزہ احوال کا متحمل ہے یا نہیں، اس کے لیے ہم اپنے کو مجبور پاتے ہیں۔

اگر یہ صحیح ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، تو یقیناً یہ بھی صحیح ہے کہ ایمانی کیفیت کا اندازہ انسان کے اعمال وافکار ہی سے کیا جاسکتا ہے، خود ان یہودیوں کو جن کی داستانِ آخرت فراموشی ابھی آپ نے سنی، اس جرم کا مرتکب قرار دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے علمِ غیب کا حوالہ دیا ہے یا خود ان کے اپنے طرزِ فکر اور طریقِ عمل کو بطور گواہ پیش کیا ہے؟ اسی طرح منافقوں کے معاملہ لیجئے، اللہ تعالیٰ نے کیا اس بنیاد پر انہیں منافق فرمادیا تھا کہ وہ ان کے دلوں کے اندر چھپی ہوئی خباثتوں کا علم رکھتا تھا یا اس بنیاد پر کہ ان کے اعمال خود اپنی زبان سے پکار پکار کر ان کے نفاق کا اعلان کررہے تھے؟ قرآن میں پہلے خیال کی تائید آپ کو کہیں سے نظر نہیں آئے گی، اس کے برعکس آپ کو اس میں اس طرح کے الفاظ ملیں گے اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا یَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ (توبہ ۱۶) ''کیا تم نے گمان کر رکھا ہے کہ یونہیں چھوڑ دیئے جاؤ گے؟ حالانکہ ابھی تک تو اللہ نے جانا ہی نہیں کہ تم میں سے کون راہِ حق میں جہاد کرنے والے ہیں۔

**ڈاکٹر سیّد اسرار الحق سبیلی**۔اسسٹنٹ پروفیسر وصدر شعبۂ اردو گورنمنٹ ڈگری کالج سدّی پیٹ، تلنگانہ

# حمید سہروردی اور بچوں کی کہانیاں

پروفیسر حمید سہروردی اردو کے ایک باوقار اور معروف افسانہ نگار ہیں۔اردو کے قدیم مرکز اور حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کے شہر گلبرگہ سے پیدائشی تعلق کی بنا پر ان کی شخصیت اور فن میں اعتماد، وقار، پاکیزگی، خلوص، حسنِ اخلاق، تصوّف، تزکیہ اور اصلاح کا عنصر رچا بسا ہوا ہے۔ملکی سطح پر وہ ایک منجھے ہوئے افسانہ نویس کی حیثیت سے ایک منفرد وممتاز مقام کے حامل ہیں۔ان کے افسانوں میں الفاظ کا برمحل وبرجستہ استعمال، ملائمت وگھلاوٹ، منفرد ودل کش اسلوب، رشتوں کا تقدّس، جذبوں کی صداقت اور تعمیری واصلاحی پہلو ہر جگہ نمایاں رہتا ہے۔

بنیادی طور پر حمید سہروردی بڑوں کے افسانہ نگار ہیں، لیکن بچوں کے لئے بھی دو چار کہانیاں لکھی ہیں۔ان کی ایک کہانی: ,,تلاش،، کو ان کے قابلِ فخر فرزندِ رشید اور منفرد اہلِ قلم ڈاکٹر غضنفر اقبال نے جنوبی ہند میں بچوں کی کہانیوں کے انتخاب: ,,جوہی کی مالا،، میں شامل کیا ہے۔یہ کہانی تین نوجوان لڑکوں کی ہے جو تعلیم کے بعد بے روزگاری کے شکار ہیں، اور نوکری تلاش کر کے تھک چکے ہیں، ان میں سے ایک لڑکا انور وقت ضائع کرنے کے بجائے عارضی طور پر پان کا ڈبہ کھول لیتا ہے، لیکن اس کے دونوں ساتھی احمد اور اسلم پان ڈبہ کو اپنی کسرِ شان سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر پان ڈبہ ہی کھولنا تھا تو بی۔اے اور ایم۔اے کرنے کی کیا ضرورت تھی، جب کہ انور انہیں سمجھاتا ہے کہ تعلیم کا مقصد صرف نوکری کا حصول نہیں ہے، تعلیم سے ہمیں اچھے برے میں تمیز پیدا ہوتی ہے، تعلیم کردار سازی، اخلاق، آداب اور سادگی کا سبق دیتی ہے، لیکن اسلم اور احمد پر انور کی باتوں کا کچھ اثر نہیں ہوتا ہے، وہ بدستور بے کاری کے ٹھیکہ دار بنے رہتے ہیں، اور موقع بہ موقع انور کے پان ڈبہ پر آ کر اس سے ملاقات کرتے ہیں، اب تک ان کے جیب خالی ہیں، جب کہ انور کا پان ڈبہ دن بدن ترقی کرتا جاتا ہے۔کہانی: ,,تلاش،، سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''بارش کی رفتار میں کمی آ چکی تھی۔رات بھیگتی جا رہی تھی۔سڑکوں پر خاموشی طاری ہو چکی تھی۔یہ تینوں وہاں سے اٹھے۔کچھ دیر خاموش رہے۔احمد نے انور سے کہا: تم نے پان کے ڈبے لگانے کا پکا ارادہ کر لیا ہے؟ انور نے پورے اعتماد سے کہا: ہاں میں نے یہی طے کر لیا ہے۔احمد نے انور سے سوال کیا: پھر ٹھیک ہے، لوگ تمہارا مذاق اڑائیں گے، تم اپنی ڈگری کا خیال رکھو گے نہیں؟ انور نے اسی اعتماد سے کہا: مذاق کیوں اڑائیں گے۔کیا میں چوری کر رہا ہوں؟ کسی کو دھوکہ دے رہا ہوں؟ کہیں ڈاکہ ڈال رہا ہوں؟ کیا میں اپنی عزت بیچ رہا ہوں۔۔۔ کیا میں۔۔۔۔'' (جوہی کی مالا: ۳۲ مرتب: ڈاکٹر غضنفر اقبال، رحمانی پبلی کیشنز مالیگاؤں ۲۰۱۸ء)

اس طرح کہانی نویس نے بچوں کو تعلیم کا مقصد، کیریئر اور کام کی عظمت کا احساس دلانے کی کوشش ان ہی کی زبان میں اور ان ہی کے ذریعہ کی ہے، جو ایک کامیاب تیکنک

ہے۔

ایسی ہی ان کی ایک کہانی ,,نجات،، ہے، جو ان کے افسانوی مجموعہ:,,شہر کی انگلیاں خونچکاں،، میں شامل ہے، اس کہانی کا کردار فیاض ہے، جو بی۔اے کرنے کے بعد پانچ سال سے مسلسل بے کاری کا شکار ہے۔بی۔اے میں درجۂ اول سے کامیابی حاصل کرنے کے بعد دنیا کے ہر غریب نوجوان کی طرح خوابوں کی حسین دنیا تعمیر کرنا چاہتا ہے۔امید اور ناامیدی کی کش مکش کے دوران ایک دن اس کو لاٹری کا انعام حاصل ہو جاتا ہے۔لاٹری کے پیسے ملنے کے بعد اس کے دل میں سماج سے بدلہ لینے کی شدید خواہش پیدا ہو جاتی ہے، وہ اپنی دولت کے بل بوتے پر اس سماج میں ہر وہ برائی کئے جاتا ہے جسے دیکھ کر انسانیت لرز اٹھتی ہے۔اس کے باوجود وہ ہر محفل میں مسندِ صدارت پر براجمان نظر آتا ہے، اور رات کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں سماج کے ایک ایک حصہ پر زنگ آلود کیل ٹھونک کر خوب بدلہ لیتا ہے۔ایک دن اس کے ضمیر نے حد درجہ ملامت کی۔اور اسے سلانے کے لئے پے در پے نیند کی گولیاں کھانے کے بعد بھی اس کا ضمیر جاگتا رہا تو اس نے پیڈ اٹھایا اور اپنی ساری دولت قحط زدہ علاقہ کے لئے وقف کر دی، تب کہیں جا کر اس کے ضمیر کو اس جہانِ فانی سے نجات مل گئی۔کہانی کا اختتام افسانوی انداز میں یوں ہوتا ہے:

> ''رات کی سیاہی آہستہ آہستہ چھٹ رہی تھی اور ماحول پر گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔صبح ہوئی تو سماج میں اس کے گیت گونج رہے تھے اور مؤرخ اس کی انسانیت نوازی کی تعریف لکھ رہا تھا۔فیاض کی آنکھیں اب بھی کھلی تھیں اور اس دنیا کو حیرت سے تک رہی تھیں''۔(شہر کی انگلیاں خونچکاں :۵۱۰، کاغذ پبلشرز گلبرگہ، ۲۰۱۶)

اس کہانی میں بے روزگاری، حرام کمائی، سیہ کاری، سماجی ظلم واستحصال، سماجی نابرابری اور اس کے خلاف بدلہ لینے کی خواہش جیسے مسائل کو ابھارا گیا ہے، اور ان سے نجات اور توبہ کا راستہ بھی دکھایا گیا ہے۔منظر کشی اور سماں بندی دوسری کہانیوں کی طرح یہاں بھی دل کش، دل آویز اور لائقِ تحسین ہے۔

حمید صاحب کی ایک کہانی مسوّدہ کی شکل میں میرے سامنے ہے:''بات بس اتنی سی''۔اس کہانی میں ایک غریب گھرانے کے لڑکے سلیم کا کردار ہے، جس کے پیدا ہونے کے ایک سال بعد اس کا باپ پلیگ میں موت کا شکار ہو گیا۔سلیم کی ماں نے محنت مزدوری کر کے سلیم کو تعلیم دلائی۔سلیم نے کالج کی تعلیم جاری رکھی اور ماں کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے ٹیوشن دینا شروع کیا۔اچانک دماغی بخار میں سلیم کی ماں کا بھی انتقال ہو گیا اور سلیم یتیم کے ساتھ یسیر بھی ہو گیا۔وہ خود کو بے سہارا سمجھنے لگا، مگر اس نے ہمت نہیں ہاری، اور زندگی کی گاڑی کھینچنے لگا۔سلیم اپنی ملنساری، خوش مزاجی، بڑوں کا ادب اور چھوٹوں سے محبت کی بنا پر محلے بھر میں ہر دل عزیز تھا۔جب اس کی حادثاتی موت کی خبر اس کے محلے میں پہنچی تو سارے لوگ تعزیت کے لئے اس کے گھر امڈ آئے، لیکن دو دن بعد سلیم بخیر وعافیت اپنے گھر واپس آ گیا، کسی کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ جس کی موت کا ہم غم منا رہے تھے وہ ہمارے سامنے کھڑا ہے، سلیم نے بتایا کہ بات یوں تھی کہ میرے ضروری کاغذات بس میں چھوٹ گئے،، اسے لانے کے لئے مجھے دوبارہ سفر کرنا پڑا۔وہ کاغذات تو مل گئے، مگر جب رات میں بس اسٹینڈ کی میز پر سو رہا تھا کسی نے میری جیب اڑا لی، میرے پاس واپس آنے کے لئے پیسے نہیں تھے، جس آدمی نے میرا بٹوا چرایا تھا وہ باؤلی

میں پھسل کر مر گیا، اس کی جیب سے میرا بٹوا نکلا جس میں میرا پتہ تھا، پولیس نے یہی سمجھا کہ یہ مرنے والے کا پتہ ہے۔ اس نے میرے آفس تار بھجوادیا۔ ''بات بس اتنی تھی''۔ کہانی میں ماں کی تربیت کا اثر ملاحظہ ہو:

''اسے بچپن سے یہ سبق سکھایا گیا تھا کہ ہر کام پوری ذمہ داری سے کرنا چاہئے۔ کسی کام میں بے ایمانی نہیں کرنا چاہئے۔ اس کی ماں ان پڑھ ضرور تھی، مگر وہ ہمیشہ اپنے بیٹے کو کام کی ذمہ داری پر توجہ دینے پر زور دیتی تھی۔ اور سلیم بھی اپنے تمام کام پوری ذمہ داری سے کرتا تھا''۔

یہ کہانی بھی بچوں کے زمرہ میں شامل کی جانے کے لائق ہے کہ اس میں سلیم کے بچپن سے لے کر جوانی، اس کے یتیم ویسیر ہونے اور اس کے حسنِ اخلاق کی وجہ سے محلے بھر میں ہر دل عزیز ہونے کو نمایاں کیا گیا ہے۔

پروفیسر حمید سہروردی کے افسانوی مجموعہ ,,شہر کی انگلیاں خونچکاں،، کی ایک مختصر کہانی ,,سفید پرندے،، کو میں بچوں کی کہانیوں کے زمرہ میں شامل کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

کہانی: ''سفید پرندے'' ایک کم سن اسکولی بچے کا خواب ہے، جس نے نیند میں سفید پرندے دیکھے تھے، بچہ سویرے اٹھ کر باپ کو جگا کر ان سے ان پرندوں کا نام پوچھتا ہے۔ باپ کو اپنے بچپن کی یاد آجاتی ہے، جب اس نے بھی اپنے والد سے یہی سوال کیا تھا کہ بابا سفید پرندے ہمارے ساتھ میں کیوں نہیں آتے؟ باپ ابھی سوچ کے سمندر میں غوطے ہی لگا رہا تھا کہ بچے نے دوسرا سوال کیا کہ پرندے آسمان کے نیچے ہی کیوں اڑتے ہیں؟ بچے کا تیسرا سوال تھا: کیا آپ کی آنکھوں میں رات پرندے نہیں آتے؟ بابا کچھ لمحے خاموش رہ کر جواب دیتا ہے: ہاں! ہماری آنکھوں میں پہلے سفید پرندے آیا کرتے تھے، مگر اب نہیں آتے، ہماری آنکھوں سے تمہاری آنکھوں میں جا بسے ہیں۔ باپ اخبار کی سرخیوں میں منہمک ہو جاتا ہے۔ بیٹا پھر سوال کرتا ہے: بولو نا بابا۔۔۔ پرندے آنکھوں میں کہاں سے آتے ہیں؟ بیٹا باپ کی بے زاری دیکھ کر خاموش ہو گیا اور بستر سے اٹھ کر ماں کے پاس چلا گیا، اور ماں سے بھی وہی سوال دہرانے لگا۔ ماں نے ڈانٹا: ,,دیوانہ بچہ! پرندے آنکھوں میں کیسے آتے ہیں۔ وہ تو دور آسمانوں میں اڑتے ہیں۔ چلو جلدی منہ ہاتھ دھولو۔ میں تمہیں رات میں چندا ماما کی کہانی سناؤں گی''۔

بچہ کہتا ہے: ''نہیں امی! میں چندا ماما کی کہانی نہیں سنوں گا، ہاں امی، چندا ماما آسمانوں میں کیوں رہتا ہے؟ زمین پر کیوں نہیں آتا؟ اتنی دور کیوں رہتا ہے؟ ماں غصہ سے کہتی ہے: پہلے یہاں سے جاؤ اور منہ ہاتھ دھو کر تیار ہو جاؤ۔ ناشتہ کر کے اسکول جانے کی تیاری کرو۔ بیٹا خاموش ماں کو تکنے لگتا ہے۔۔۔ اور پرندے اس کی آنکھوں سے دور بہت دور چلے گئے ہیں''۔ (شہر کی انگلیاں خونچکاں: ۱۸۶)

اس کہانی میں سہانا بچپن، بچپن کی یاد، بچہ کی معصومیت، اس کا معصومانہ خواب، اس سے متعلق معصومانہ سوالات کی کثرت اور بچوں کی نفسیات اسے بچوں کی کہانیوں میں شامل کرنے کا جواز عطا کرتے ہیں۔ بچوں کے اندر فطری طور پر تجسس اور معلومات حاصل کرنے کا مادّہ زیادہ ہوتا ہے۔ اس کے ذہن میں سیکڑوں سوالات کلبلاتے رہتے ہیں۔ ماں باپ اپنی مصروفیات کی بنا پر اسے ڈانٹ ڈپٹ کر اس کے فطری تجسس اور معلومات حاصل کرنے کے قیمتی جذبے کو کچل دیتے ہیں۔ بچوں کے ایسے لامتناہی سوالات کے جوابات

بچوں کے ادب میں ہی مل سکتے ہیں۔

اسی طرح کی ایک کہانی: ,,آگے پیچھے،، ہے، جس میں خواب کے انداز میں بچہ کو زندگی کے نشیب وفراز، دوست و دشمن اور نیکی و بدی کو علامتی اور اشاراتی زبان میں واقف کرایا گیا ہے، اور زندگی کی تاریکیوں سے نکال کر اجالے کی طرف لانے کی نفسیاتی اور شاعرانہ کوشش کی گئی ہے۔ کہانی کی ابتداء نصیحت آمیز ہونے کے ساتھ افسانوی اسلوب لائق تحسین ہے:

''اور ہاں اچھی طرح یاد رکھو۔۔۔۔۔بغیر سمت کا تعین کئے آگے بڑھنا مناسب نہیں۔ یوں بھی راستے سیدھے نہیں ہیں۔ آڑے ترچھے، نیچے اوپر، اور تو اور کہیں کہیں راستہ نہ ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ دیکھو گھبراؤ نہیں۔ ہمت اور جرأت سے میدان مارلو گے اور جب تمہیں راستہ نظر نہ آئے خود ہی راستہ پیدا کرلو اور اس کا افتتاحی ربن کاٹ دو۔ تمہیں پورا پورا حق ہے''۔ (دیکھئے: شہر کی انگلیاں خونچکاں ۳۴۷۔۳۵۲)

بچوں کا ادب تحریر کرنے اور اس میں کامیابی کے لئے زبان وقلم کا پختہ اور منجھا ہوا ہونا ضروری ہے، جناب پروفیسر حمید سہروردی ان صفات سے متصف ہیں، انہوں نے اپنے اور قوم کے بیٹوں، بیٹیوں اور بھائی، بہنوں کے لئے خوب لکھا ہے۔ اب میں حضرت سے مؤدبانہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ اب اپنے اور ملت کے پوتروں، پوتریوں اور نواسے، نواسیوں کے لئے براہِ راست ادب لکھ کر ان کی پیاس بجھانے کی کوشش کریں، اور ان کی تربیت اور اخلاق و کردار سازی کا مقدّس فریضہ انجام دے کر نجات اور ابدی عیش وراحت کا توشہ تیار کریں۔

**رہبر پرتاپ گڑھی**

# غزل

آشنا ہوں میں بھی رنج وغم کی ہر تاثیر سے
اس لیے میرا بھی رشتہ ہے جناب میر سے

لب ہلانے کی بھی جرأت مجھ کو ہوسکتی نہیں
''راستے میں وہ اگر مل بھی گئے تقدیر سے''

سارے عالم میں ملی ہے سرخروئی دین کو
جنگ ہم نے جیتی ہے اخلاق کی شمشیر سے

مفلس وزردار میں زیبا نہیں ہے امتیاز
ہر کسی سے پیش آنا ہے سدا توقیر سے

مسکراہٹ ہی بتا دیتی ہے دل کی کیفیت
ہر ادا ہوتی ہے روشن باطنی تنویر سے

کرتی ہیں مسرور انساں کو یہ تصویریں مگر
دل سکوں پاتا نہیں ہے مستقل تصویر سے

کامیابی چوم لیتی ہے قدم ہر گام پر
کام جو کرتے ہیں رہبر حکمت وتدبیر سے

**محبوب خان اصغر**۔معتمد عمومی مرزا غالب اکیڈیمی حیدرآباد

# مجتبیٰ حسین کی تحریر ''سلطان محمد قلی قطب شاہ کا سفرنامہ'' ایک تجزیاتی مطالعہ

مجتبیٰ حسین ہمارے عہد کے ایک بڑے طنز و مزاح نگار تھے۔ان کی ہر تحریر میں عالمانہ اور حکیمانہ پہلو ملتے ہیں۔میری اس بات سے شاید سبھی اتفاق کریں گے کہ اچھی شاعری ہو یا بامعنی اور اچھی نثر' دونوں کی تخلیق آسان نہیں ہے۔صاحب اسلوب ہونا تو اور بھی آگے کی منزل ہے اور مجتبیٰ حسین آگے کی منزل کو پا گئے تھے،یعنی وہ صاحب اسلوب ادیب تھے۔ان کی تحریروں سے ادب کی مقصدیت اور افادیت کا اظہار ہوتا ہے۔ درحقیقت سماج بیداری ان کا مقصد تھا۔اور اسی مقصد کے تحت کوئی ستر برس تک انہوں نے ادب کی خدمت کی ہے۔آج میں نے مجتبیٰ حسین کی جس تحریر کو تجزیاتی مطالعہ کے بطور منتخب کیا ہے اس کا عنوان ہے ''سلطان محمد قلی قطب شاہ کا سفرنامہ''۔مجتبیٰ حسین نے اس مضمون کے وسیلے سے ہماری گم گشتہ تہذیب کو نمایاں کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔قلی قطب شاہ کی روح کی جو مراجعت ہے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عصر حاضر کے حیدرآباد کی صورتحال کا طنزیہ زاویہ نظر سے جائزہ لیا ہے۔ اس مضمون میں ایک افسانوی فضاء جہانگیر علی آٹو ڈرائیور سے بنی ہے۔

سب جانتے ہیں سلطان محمد قلی قطب شاہ بانی حیدرآباد ہے۔فنون لطیفہ کا دلدادہ ہے۔صاحب دیوان شاعر ہے،جس کی تخلیقات میں اس دور کی تہذیب کا مکمل عکس دکھائی دیتا ہے۔قلی کی قومی اور اجتماعی زندگی اور شعری کائنات کا جائزہ لیں تو ان کے افکار و نظریات میں جو بات واضح طور پر دکھائی دیتی ہے وہ ہے خدمت قوم،دو جے ملک کی ترقی اور کامیابی۔متذکرہ اوصاف سے معمور قلی کی ذات اس عہد کے تمام فرقوں کے لئے منفعت بخش تھی۔رعایا پروری ان کا شیوہ تھا۔بلاتخصیص مذہب،جنس و عمر سب کی بھلائی چاہنے والے اس حکمراں نے ساری دنیا میں ایک ایسی تہذیب کو پیش کیا جس کی مثال آج بھی دی جاتی ہے۔ چنانچہ مجتبیٰ حسین کی عقابی نظروں سے چار صدیوں قبل والی تہذیب کیسے چوک سکتی تھی۔قلی کی روح کی مراجعت مذکورہ مضمون کی سب سے اہم خوبی ہے۔جہانگیر علی کے آٹو میں قلی سوار ہوتے ہیں۔ چار مینار، گولکنڈہ بالاحصار، رویندرا بھارتی، موسی ندی، محکمہ آبرسانی اور دوسرے سیاسی موضوعات پر قلی اور جہانگیر کے مکالموں سے طنز و مزاح کا ایک ماحول پیدا کیا گیا ہے۔نیز تہذیبی،ثقافتی اور معاشرتی سطح پر فکر و عمل میں انحطاط اور جمود پر مکالمہ اور بین السطور شہر کی بنا کے مقاصد کا اعادہ کیا گیا ہے۔

''میں اس سے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا اور آٹو

رکشا میں بیٹھ گیا۔ اس نئی سواری کا جائزہ لے کر میں نے کہا: ''مگر تم اسے ندی میں سے کیسے لے جاؤ گے؟ بولا حضور! جسے آپ بار بار ندی کہہ رہے ہیں اس میں اب پانی نہیں رہتا، مچھر اور بھینسیں رہتی ہیں، برسہا برس بیت گئے میں نے اس ندی میں کبھی پانی نہیں دیکھا۔ میں نے پوچھا پھر اس شہر کے لوگ اپنی پیاس کس طرح بجھاتے ہیں؟ جہانگیر علی بولا: حضور! اس کے لئے اس شہر میں ایک محکمہ آبرسانی موجود ہے جس کا کام نلوں سے نہیں بلکہ اس شہر کے باسیوں کی آنکھ کے ذریعہ پانی سربراہ کرنا ہے۔ لوگ دو دو تین تین دن انتظار کرتے ہیں تو اس شہر کے نلوں میں چار پانچ قطرے نکل آتے ہیں۔ البتہ عوام کی آنکھوں کا پانی کبھی نہیں مرتا۔ یہ الگ بات ہے کہ شہر کے حکمرانوں کی آنکھوں کا پانی مرگیا ہے'' (آخر کار، صفحہ:40)

ان سطور کی قرأت سے اس بات کی گرہ کشائی ہوتی ہے کہ قلی ''ماضی'' ہے اور جہانگیر ''حال''۔ ماضی ''روشن'' ہے اور حال ایک ''خارزار'' یا ''اجالوں'' سے ''ظلمت'' کی طرف ایک سفر ہے۔ اور اس سفر میں نئی سواری ''آٹو'' ہے جو عہد قلی میں وجود میں نہیں آیا تھا۔ دیگر باتوں سے بصیرتیں حاصل ہوتی ہیں جو مسائل کی فہم کو سہل بناتی ہیں۔

مجتبیٰ حسین نے لفظ پانی کا محاورائی استعمال بڑے ہی فنکارانہ انداز میں کیا ہے۔ پانی کا قحط، لوگوں کی آنکھوں سے پانی کا نکل جانا، اشکباری، یہ لفظیات شہریوں کے مسائل کو ظاہر کرتے ہیں۔ ''حکمرانوں کی آنکھوں کا پانی مرگیا ہے'' حکومت کی بے حسی کو ظاہر کرتا ہے۔ اور مجتبیٰ حسین کی سیاسی بصیرت کا خوب اندازہ ہوتا ہے۔

مجتبیٰ حسین آگے لکھتے ہیں:

''تم ندی میں سے کیوں نہیں چلتے''؟ بولا: سرکار! اگرچہ یہ ندی بالکل نہیں بہتی لیکن اس وقت رات کا پچھلا پہر ہے۔ یہ وقت مچھروں اور دیگر حشرات الارض کے آرام کرنے کا ہے۔ اس وقت رعایا کے آرام میں خلل ڈالنا آپ کو زیب نہیں دے گا'' (ایضاً صفحہ 40)

اس پیرا گراف کا کلیدی لفظ ''رعایا'' ہے۔ حکمرانوں کے لئے مچھر اور دیگر حشرات الارض ہی اب رعایا ہیں۔ عوام کے تعلق سے حکمرانوں کا رویہ اب ایسا ہی ہے، جیسا کہ مجتبیٰ حسین نے اظہار کیا ہے کہ وہ عوام کو کیڑے اور مچھر ہی سمجھنے لگے ہیں۔ اور اس حقیقت کا ادراک سب ہی کو ہے، لیکن مجتبیٰ حسین نے فنی اظہار کے ذریعہ بے حس لوگوں کو بھی محظوظ کروانے کی کوشش کی ہے، یہ ان کے قلم کی توانائی ہے۔

محض آپ کی دعا کی وجہ سے چار سو برس پہلے شاید دعا رہی ہو تو ہو لیکن اب بددعا لگتی ہے، اس شہر میں کتنے لوگ کیڑوں مکوڑوں کی طرح آباد ہیں۔ سمندر میں اتنی مچھلیاں آباد نہیں ہیں جتنے اس شہر میں لوگ آباد ہیں۔ (ایضاً صفحہ:41)

دراصل قلی قطب شاہ نے شہر کے لئے دعا کی تھی کہ

میرا شہر لوگاں سوں معمور کر
رکھیا جوں تو دریا میں من یا سمیج

قلی قطب شاہ چاہتے تھے کہ یہ شہر آدمیوں سے بسا

رہے۔ قلی نے یہ احساس بھی دیا ہے کہ آبادی بڑھانے سے فائدہ نہیں ہے، انسان کی ذہنی تربیت بھی ضروری ہے۔ عالم اور دانشور قسم کے لوگوں نے اپنے فہم کی ساری کاوشیں پیسہ بنانے میں لگا دیں۔ ملک کا سیاسی، تمدنی اور معاشرتی نظام برباد ہوگیا اور پستی عوام کا مقدر بن گئی۔ مذہب، سیاست، معاشرت، اور تہذیب وتمدن کے بگاڑ کے لئے شفاف اصلاحی تحریکیں نہیں چلائی گئیں۔ نتیجتاً ہر طرف ایک گھٹن اور حبس ہے۔

جہانگیر علی بولا: حضور! اب حکمراں حکومت کا بوجھ نہیں اٹھاتے بلکہ حکومت خود ایک ایسا بھاری بوجھ ہے جسے عوام اٹھاتے ہیں اور گرتے پڑتے چلتے رہتے ہیں۔ (ایضاً:43)

مجتبیٰ حسین یہ بتاتے ہیں کہ حکومت یا حکمرانوں نے عوام پر مختلف جہتوں سے بوجھ ڈالا ہے۔ عدم انصاف، ٹیکس، ذہنی اور طبی بوجھ حکمرانوں کی طرف سے عوام پر ہے۔ مصنف نے تین دہائیوں قبل یہ مضمون لکھا تھا اور یہ صورتحال اس وقت کی ہے۔ اب صورتحال اور بھی بدترین ہے۔

''سرکار! جانے سے پہلے رویندرا بھارتی تھیٹر ضرور چلئے'' میں نے پوچھا: ''یہ کیا ہے؟'' بولا: یہ اس شہر کی ایسی جگہ ہے جہاں تہذیبی سرگرمیوں کے ذریعہ طوفان بدتمیزی مچایا جاتا ہے۔ آج یہاں ایک مشاعرہ ہورہا ہے، آپ تو خود شاعر رہ چکے ہیں۔ آپ بھی چلئے۔ میں نے کہا: جہانگیر علی! تمہیں شاید پتہ نہیں کہ ہم اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر رہ چکے ہیں اور اس شہر کے بانی بھی۔ لہٰذا ایک عام شاعر کی طرح ہمارا وہاں جانا ہمارے شاہانہ اور شاعرانہ مزاج کے خلاف ہوگا''۔

جہانگیر علی بولا: سرکار! یہاں کا عام شاعر بھی خاص شاعر ہی ہوتا ہے۔ خاص خاص موقعوں پر عام شاعر کو بڑی مشکل سے تلاش کر کے بلایا جاتا ہے۔ یہاں شعراء دوسرے شعراء کے مصرعے تو ضرور اٹھاتے ہیں لیکن ساتھ ہی ایک دوسرے کی ٹانگیں بھی کھینچتے جاتے ہیں، جس کی وجہ سے خود اکثر شاعر بے وزن ہوجاتے ہیں۔'' (ایضاً صفحہ: 43)

مندرجہ بالا سطور شاعر اور مشاعروں کی صورتحال کے تناظر میں ہیں۔ اس طرح کے مضامین مجتبیٰ حسین نے بارہا لکھے ہیں، جس میں شاعرات، تشاعر، غزل مینوفیکچر کمپنی، مجرے کو موضوع بنایا ہے۔ یہاں بھی انہوں نے مکالموں کے ذریعہ یہ بتایا ہے کہ شاعروں کے درمیان کتنے فاصلے ہیں۔ گروپ بندیاں ہیں، بغض ہے اور عداوتیں ہیں۔ مصنف کی مشاعروں سے بیزارگی کا سبب کیا ہے۔ میرا ایسا قیاس ہے کہ عروضی پہلوان نظم کرتے ہیں اور نظم کرنا سکھاتے بھی ہیں، لیکن تخلیقی صلاحیت ان کے بس کا روگ نہیں ہے۔ شاعری کے نام پر خس وخاشاک کا ڈھیر لگایا جاتا ہے جو ادب میں اضافہ نہیں ہے۔ ایسی صورتحال پر مصنف نے کاری ضرب لگائی ہے اور محسوس کروانے کی کوشش کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی محسوس کرنا نہیں چاہتا۔

مضمون کا آخری حصہ کے چند سطور ملاحظہ فرمائیں۔

''میں اتنی بلندی سے پھر اس شہر کی پستی کی طرف نہیں جانا چاہتا اور یوں بھی بالا حصار سے اوپر کی دنیا بہت قریب ہے۔ خدا حافظ۔ جہانگیر علی نے کہا: ظل الٰہی! آپ کی دعا میں بڑی تاثیر ہے، جاتے جاتے

ہم حیدرآبادیوں کے لئے کوئی نئی دعا تو کرتے جایئے"۔ میں نے کہا: جہانگیر علی! میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس شہر میں رہنے والوں کے اندر صبر جمیل کا مادہ پیدا کرے۔ کیونکہ اس چیز کے بغیر اب اس شہر کے باسیوں کا زندہ رہنا مشکل نظر آرہا ہے"۔

مضمون کے مصنف مجتبیٰ حسین نے مرکزی خیال کو بڑی عمدگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ شہر بلندی سے پستیوں کی طرف جارہا ہے۔ شہر کا ذہنی سفر مائل بہ زوال ہے۔ قلی ایک حساس انسان ہے جو دنیا سے گزر گیا ہے۔ روح کی مراجعت ہوتی ہے۔ خالق کائنات اپنی قدرت سے اسے زندہ بھی کردے تو دنیا اسے گوارہ نہیں ہے۔ لوگوں میں صبر و برداشت کا مادہ اور خودستائی سے پرہیز کا جذبہ پیدا ہوجائے تو امکان ہے کہ معاشرے میں سدھار آجائے، لیکن مضمون کی سن اشاعت سے آج تک کسی میں بھی صبر و برداشت دکھائی نہیں دیتا۔ نہ ہی کوئی خودستائی سے باز آنے کے لئے تیار ہے۔

نفسی نفسی کا عالم ہے، آثار قیامت کی جھلکیاں دکھائی دے رہی ہیں۔ مجتبیٰ حسین نے اپنی اس تحریر سے نہ صرف شہر حیدرآباد بلکہ پورے ملک کے تئیں اپنی فکر کا اظہار کیا ہے جو کہ فطری ہے۔ عہد کے مسائل، جبر اور تعصّبات کے قہر پر غور و فکر کا سلسلہ قوم سے عالمیت تک پھیل جاتا ہے تو ایسی تحریریں وجود میں آتی ہیں، جو مصنف کو مرنے نہیں دیتیں۔


**جامعۃ البنات الاصلاحیۃ** حیدرآباد (ملک پیٹ)

لڑکیوں کی اعلیٰ دینی وعصری تعلیم کا فکری واصلاحی معیاری مرکز

**شعبہ جات:** تحفیظ القرآن الکریم ★ شعبہ ابتدائیہ (دوسال) ★ شعبہ عالمیت (چارسال) ★ شعبہ فضیلت (دوسال)

☆شہر سے اہم مقامات سے آمدورفت کی سہولت ☆دوردراز کی طالبات کے لیے ہاسٹل کا نظم ☆عثمانیہ یونیورسٹی سے میٹرک تا ایم۔اے امتحانات دلوانے کا نظم

لڑکیوں کے لیے قرآن، حدیث، فقہ، ادب، سیرت، تاریخ کے علاوہ انگریزی زبان کے اعدادیہ تا فضیلت چھ سال تعلیم کا بہترین نظم ہے

رابطے کے لیے پتہ:
JAMIATUL BANAT AL-ISLAHIYAH
#16-3-993/1, NEAR DAWN HIGH SCOOL
OFFICERS COLONY, NEW MALAKPET,
HYDERABAD(T.S) INDIA 500036

**نصب العین:** انقلاب بذریعہ تعلیم قرآن وسنت کی گہری بصیرت، شہادت حق، احیائے دین کی استعداد اور امت کے لیے داعیانہ، مجاہدانہ اور قائدانہ کردار کی حامل "المرأۃ الصالحۃ" ٹیم کی تیاری۔
☆شعبہ تحفیظ القرآن اور شعبہ ابتدائیہ وعالمیت کے پہلے سال میں داخلے سال بھر جاری رہیں گے۔ اعلیٰ دینی تعلیم کے حصول کے خواہشمند سرپرست حضرات سے اپنی لڑکیوں کے ہمراہ جلد رجوع ہونے کی خواہش کی جاتی ہے۔

جامعۃ البنات الاصلاحیۃ حیدرآباد کا استحکام وقت کا اہم تقاضہ اور ملی فریضہ ہے۔ اس اہم مرکز کی تعمیر وترقی ک لیے مالی اور اخلاقی تعاون فرما کر ہمارے حوصلے کو قائم رکھیں۔

ناظم: مولانا عبدالعلیم اصلاحی
موبائل 9676202819

صدام حسین ۔ ریسرچ اسکالر: شعبۂ اردو۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

# اردو فکشن میں اودھ کی تہذیب وثقافت: قاضی عبدالستار کے حوالے سے

قاضی عبدالستار کا شمار ان ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو ہندی دونوں ہی زبانوں میں اپنے فکر وفن کا لوہا منوایا ہے ۔قاضی عبدالستار ایک ممتاز ومنفرد اور مخصوص نثری اسلوب کا نام ہے ۔انھوں نے بیک وقت فکشن کی دونوں سطحوں پر اپنی انفرادیت اور کمال فن کے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔

قاضی عبدالستار نے ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا لیکن انھیں شاعری میں تسکین نہیں ہوئی اور انھوں نے ۱۹۴۷ء میں پہلا افسانہ ''اندھا'' کے عنوان سے لکھ کر فکشن کی دنیا میں قدم رکھا۔ یہ افسانہ اگلے سال شارب رودولوی کے تعریفی کلمات کے ساتھ لکھنؤ کے ایک جریدے ''جواب'' میں شائع ہوا لیکن ان کی شہرت 'کتاب' لکھنؤ میں شائع ہونے والے افسانے ''پیتل کا گھنٹہ'' سے ہوئی ۔اس افسانے کی شہرت بڑی تیزی کے ساتھ ادبی دنیا میں پھیل گئی ۔ان کے ادبی سرمایہ میں تقریباً ڈیڑھ درجن ناول، پچاس سے زائد افسانے ،تنقیدی نوعیت کی دو کتابیں اور متعدد علمی، ادبی، تحقیقی اور تنقیدی مضامین شامل ہیں۔

قاضی عبدالستار کی بنیادی شناخت ادبی تاریخ نگاری کے حوالے سے ہے۔ انھوں نے شاندار تاریخی ناول لکھے اور افسانے بھی ۔قاضی عبدالستار سے قبل شرر وغیرہ نے بھی تاریخی ناول لکھے ہیں مگر قاضی صاحب نے بدرجہ کمال تاریخ کو ادب کا حصہ بنایا ہے اور مسلسل کئی عدد تاریخی ناول صرف قاضی عبدالستار نے ہی لکھے ہیں ۔انھوں نے شرر کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے ایک منفرد رویہ اور مخصوص ادبی طرز اپنایا ہے۔ تاریخ نگاری میں ان کی انفرادیت کو پروفیسر صغیر افراہیم نے یوں بیان کیا ہے:

> ''ان کے یہاں تاریخ نگاری محض بادشاہوں کی شکست و فتح سے عبارت نہیں ہے بلکہ اس کے پس پشت عوامی قوتوں کی پردہ کشائی اور جہد مسلسل کی ایک طویل داستان ہے، ایسی داستان جس میں قوموں کی تقدیر بدلنے دینے کی طاقت محسوس ہوتی ہے۔ انھوں نے بادشاہوں اور شہنشاہوں کو مافوق الفطرت کرداروں کی طرح نہیں بلکہ عام انسان کے روپ میں پیش کیا ہے۔''

قاضی عبدالستار کا تعلق چونکہ ایک زمیندار گھرانے سے تھا اس لیے ان کی زیادہ تر تخلیقات کا پس منظر اودھ کے دیہات ہیں اور ان کے موضوعات علاقہ اودھ کی جاگیردارانہ اور زمیندارانہ تہذیب کا زوال اور اس کے دور رس اثرات ہیں۔ان کے ناولوں میں زمینداروں کی طرز زندگی اور معاشرتی نظام کا گہرا مشاہدہ اور تجزیہ ملتا ہے۔ان کی بیشتر تخلیقات میں اصل کردار بھی زمینداروں اور تعلقداروں کا ہی ہوتا ہے۔ان کے افسانوں میں جہاں ایک طرف اودھ کی زوال آمادہ تہذیب اور اس کی دگرگوں صورت حال کا دلکش مگر پرسوز بیان ملتا ہے وہیں ان میں ایک بڑی سماجی تبدیلی کی آہٹ بھی دکھائی دیتی ہے۔اس ضمن میں پروفیسر صغیر افراہیم اپنے مضمون 'ایک افسانوی کردار: قاضی عبدالستار' میں لکھتے ہیں:

> ''قاضی عبدالستار نے تاریخی موضوعات سے ہٹ کر جو

ناول لکھے وہ جاگیردارانہ اور زمیندارانہ تہذیب کے زوال اور اس کے دوررس اثرات کا آئینہ ہیں۔''

قاضی عبدالستار نے اپنے فکشن میں نہ صرف اودھ کی زوال شدہ تہذیب اور زمیندارانہ نظام کے پس منظر کو پیش کیا ہے بلکہ ان کے یہاں غریب، مظلوم اور کمزور دیہی معاشرہ بھی پوری طرح موجود ہے۔ دیہات کے مظلوم کسانوں اور کمزور لوگوں کی عکاسی پریم چند نے بھی کی ہے مگر قاضی عبدالستار پریم چند سے بایں طور مختلف نظر آتے ہیں کہ ان کے یہاں اگر ایک طرف ظلم و جبر، تشدد اور استحصال ہے تو دوسری طرف احتجاج، بغاوت، ایک نئے عہد کی آہٹ اور ایک نئی جدوجہد کی واضح تصویر بھی ہے۔ ان کے یہاں اگر ایک طرف زمیندار اور تعلقدار کے ظلم و جبر کی دردناک داستان ہے تو دوسری طرف غریب اور مظلوم طبقہ بھی اپنے کڑے تیوروں اور نئے جوش و خروش کے ساتھ موجود ہے۔ یہی قاضی عبدالستار کی انفرادیت اور امتیازی شان ہے۔ قاضی عبدالستار نے اپنے افسانوں میں شہری اور دیہی دونوں ہی پس منظر کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں جدید شہری زندگی اور جدید معاشرے کے نئے مسائل کو نہایت مؤثر اور فنکارانہ انداز میں بیان کیا ہے۔

اودھ کے آس پاس کی ثقافتی فضا اور مٹتی ہوئی جاگیر دارانہ تہذیب کے حوالے سے ان کے ناول ''پہلا اور آخری خط''، ''غبار شب''، ''بادل''، ''مجو بھیا''، اور ''شب گزیدہ'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ افسانوں میں ''نیا قانون''، ''رضو باجی'' اور ''پیتل کا گھنٹہ'' کے نام بے حد اہم ہیں۔ ان کے بیشتر ناول اور افسانے ہندی، بنگلا، پنجابی، مراٹھی، تیلگو وغیرہ میں منتقل ہو چکے ہیں۔ مذکورہ بالا تمام ناولوں اور افسانوں کا تفصیلی جائزہ اس مختصر مضمون میں نہیں پیش کیا جا سکتا البتہ موضوع کی مناسبت سے اہم اور ضروری تخلیقات کے حوالے سے گفتگو ناگزیر ہے۔

قاضی عبدالستار کا ناول 'شب گزیدہ' ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔ اس ناول کو ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس ناول میں قاضی عبدالستار نے اودھ کے ایک دیہات جام نگر کے طبقہ امراء کی خوبیوں اور خامیوں کو اجاگر کیا ہے۔ ان کا فن اس ناول میں عروج پر نظر آتا ہے۔ جاگیردار صاحب، رحمت علی، جمی اور اختر بھائی شب گزیدہ کے اہم کردار ہیں۔

بڑے سرکار جام نگر کے جاگیردار صاحب ہیں۔ وہ قدامت پرستی کا شکار ہیں۔ ان کی زندگی معمول کے مطابق گزر رہی ہے۔ انھیں کسی طرح کی تبدیلی یا انقلاب سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ دراصل رحمت علی خاں کے کہنے پر امور سلطنت کو چلاتے ہیں۔ رحمت علی خاں کا کردار ایک شاطر اور چالباز کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اپنی گندی پالیسی کے سبب جاگیردار صاحب کو کٹھ پتلی بنا کر رکھتا ہے۔ جمی جاگیردار صاحب کا اکلوتا بیٹا ہے جو لکھنؤ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہے۔ وہ روشن خیال اور زمانے کے تقاضوں کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ وہ ایک وسیع ذہن کا مالک ہے۔ وہ زندگی میں تبدیلی اور اصلاحات چاہتا ہے۔ کمزوریوں اور خامیوں کو دور کر کے وہ نہ صرف اپنی اصلاح اور ترقی چاہتا ہے بلکہ سماج اور معاشرے کی ترقی بھی اس کو عزیز ہے۔ رحمت علی خاں جو انتہائی شاطر اور مکار انسان ہے اس نے جمی کے انقلابی ذہن کو بھانپ کر جاگیردار صاحب کو خود ان کے ہی بیٹے کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا۔ نتیجہ جمی کو اس کے والد نے زہر دے کر مار ڈالا۔

جمی شعوری طور پر بیدار، دور اندیش اور ترقی پسند انسان ہے۔ وہ اپنی پھوپھی زاد بہن بیدہ سے محبت بھی کرتا ہے مگر یہ محبت بھی اس کے پائے استقلال اور حوصلوں کو پست نہیں کر پاتی۔ جمی کا کردار انجام کے لحاظ سے ایک دردناک تاثر پیش کرتا ہے۔ یہ خلوص، محبت، رواداری، وفا شعاری اور نئے عصری شعور کا نمائندہ ہے۔ وہ دوسرے رئیس زادوں کی طرح عیاش، تن آسان اور کاہل نہیں بلکہ ہمت و حوصلہ اور عقل

و دانائی کا پتلا ہے۔اس کے کردار میں فعالیت ہے۔اس کا انجام جاگیردارانہ نظام کی تہذیب کے چہرے پر ایک بدنما داغ ہےاوردوسروں کے لئے عبرت کا تازیانہ بھی۔

ناول کا ایک ضمنی لیکن بے حد اہم کردار اختر بھائی بھی ہے۔وہ پڑھ لکھ کر فارغ ہوا تو قومی اور ملکی مسائل میں دلچسپی لینے لگا۔ملک کی آزادی میں انھوں نے انگریزوں کے خلاف لڑائی میں اہم کردار ادا کیا۔کانگریس کی مجلسوں میں وہ برابر شریک ہوتے۔ان کے کردار میں ملک کے لئے ہمدردی، حوصلہ، آزادی کا جذبہ اور تڑپ ہے۔دیکھیں آزادی کے اس متوالے کے پیکر کی ایک جھلک:

''بڑھتی ہوئی حجامت نے اختر کی تلخ مسکراہٹ کو اور تلخ کردیا تھا، وہ کھدر کے کرتے پاجامے پر سیاہ واسکوٹ پہنے ہوئے تھا، ایک ٹاٹ ایسی چادر اس کے باوزن سینے کے گرہ لپٹی ہوئی تھی، اجڑے ہوئے بالوں کا ایک جنگل اس کے سرے وجود پر محیط تھا، بڑی بڑی قلمیں زرد رخساروں پر گیسوؤں کی طرح دراز تھیں، داہنے ہاتھ کی دونوں لانبی لانبی انگلیاں نیکوٹین سے پیلی تھیں، ہونٹوں پر سیاہ پٹی بندھی ہوئی تھی، لیکن آنکھوں میں الاؤ دہک رہے تھے۔''

انھوں نے ملک کو انگریزوں کے پنجہ استبداد سے آزاد کرانے کا عزم مصمم کرلیا تھا۔آزادی کے لئے وہ ہر طرح کے مصائب وآلام برداشت کرنے کو تیار تھے۔وہ ذاتی مفاد سے بڑھ کر قومی اور ملکی مسائل کو اہمیت دیتے تھے۔ان کے سینے میں ایک دردمند دل تھا اور حوصلوں میں استقلال اور جاں نثاری کا جذبہ۔

ناول 'شب گزیدہ' کے تمام کردار حقیقی اور اپنے عہد کے سچے ترجمان ہیں۔جاگیردار صاحب، رحمت علی، جمی اور اختر بھائی صرف کردار ہی نہیں بلکہ ان کے توسط سے ناول نگار نے اس عہد کے اودھ کی سیاسی، سماجی، معاشرتی اور تہذیبی حالات کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔حقائق کے اس دلچسپ بیان پر کہا جاسکتا ہے کہ قاضی عبدالستار کی دیہات اور قصبات کی زندگی پر گہری نظر ہے۔پورے ناول میں طبقاتی شعور اور اور اقدار کی کشمکش کو ناول نگار نے فنی چابک دستی کے ساتھ پیش کیا ہے۔قاضی عبدالستار نے اس ناول میں جس ماحول کو بھی پیش کیا ہے وہ متحرک اور تابناک معلوم ہوتا ہے۔ان کی بیان کردہ فضا زندگی سے بھرپور ہے۔اسی لئے قرۃ العین حیدر جیسی بلند پایہ ادیبہ کو کہنا پڑا:

''نہ صرف یہ کہ قاضی عبدالستار کو کہانی سنانے کا ڈھنگ آتا تھا، بلکہ اپنے موضوع اور کرداروں سے بڑی گہری واقفیت بھی حاصل ہوتی تھی۔اودھ کے متعلق بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔شب گزیدہ بھی اودھ کی فیوڈل تہذیب کا المیہ ہے، لیکن آزادی سے چند سال قبل کے اودھ کے یہ تعلق دار اور ان کی ہیئت محض ٹائپ یا علامتی کردار ہرگز نہیں ہیں بے حد حقیقی اور جیتے جاگتے انسانوں کی انفرادی اور طبقاتی شخصیتوں اور ان کے کربناک سماجی اور جذباتی رشتوں کے حیرت انگیز تنوع اور مٹتے ہوئے معاشرے اور انسانی ڈرامے کی بے مثال مصوری ہے۔'' شب گزیدہ'' کے ایسے ناولٹ اردو میں غالباً نہیں لکھے گئے۔''

''مجو بھیا'' ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔اس میں بھی حق ملکیت اور زر زمین کی کشاکش کو موضوع بنایا گیا ہے۔اس میں قاضی عبدالستار نے یہ دکھایا ہے کہ کس طرح ایک کردار باپ کے انتقال کے بعد طاقت کے بل بوتے پر لوٹ کھسوٹ کے ذریعے شاہانہ مراعات حاصل کرلیتا ہے۔انسان کس طرح دولت اور اقتدار کی خاطر دروغ گوئی، بے گناہوں کا قتل، کمزوروں اور مظلوموں کو ڈرا دھمکا کر اپنا الو سیدھا کرتا ہے۔اس ناول میں بھی منظور سے مجو بھیا بننے والا کردار

اپنے ذاتی مفاد کی خاطر کچھ بھی کر گزرنے کو تیار ہے۔فرد کی نفسیاتی پیچیدگی اور طبقاتی کشمکش کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ فنکار کو نفسیاتی مسائل کے بیان پر بھی کامل مہارت ہے۔بدلتی ہوئی اقدار کا گہرا علم ہے۔مجو بھیا کے حوالے سے ناول نگار نے ۱۹۴۷ء کے آس پاس کے تمام حالات سے قاری کو واقف کرادیا ہے۔

قاضی عبدالستار کا ناول ''بادل'' ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا ۔اس میں بھی قاضی عبدالستار نے لشکر پور کے ایک نوجوان ٹھاکر ریاست علی کی شادی کا دلچسپ مگر پر سوز واقعہ بیان کیا ہے ۔ریاست علی کا رشتہ مہرولی کی چودھری کی لڑکی زینت سے طے ہوجاتا ہے۔زینت ایک سانولے اور ہلکے رنگ کی لڑکی ہے لیکن اس کے یہاں ایک بادل نامی ہاتھی ہے کس کے دور دور تک چرچے ہیں ۔ریاست علی اس ہاتھی کو بہر صورت حاصل کرنا چاہتا ہے ۔وہ شادی میں بادل کو مانگتا ہے تو سب حیرت میں پڑجاتے ہیں ۔قصہ یہاں تناؤ کی شدید صورت اختیار کر لیتا ہے ۔چودھری تعجب سے کہتا ہے:

''بادل ہاتھی نہیں ہے، بادل میرا بیٹا ہے اور بیٹیوں کے جہیز میں بیٹے نہیں دیے جاتے۔''

بارات تو بنا دلہن کے لوٹ جاتی ہے مگر ریاست علی کی مکاری ، چالبازی اور فریب کاری کے نئے جال بچھانا شروع کر دیتا ہے اور ایک ٹانگ کٹوا کر کسی نہ کسی طرح بادل کے حصول میں کامیاب ہوجاتا ہے مگر بادل پاگل ہوجاتا ہے اور نحوست کی علامت بن جاتا ہے:

''کیسا منحوس جانور ہے، جس گھر میں گیا اس گھر کو اجاڑ دیا۔''

اس طرح یہ ناول اودھ اور باشندگان اودھ کا عکاس، منفرد اسلوب اور تخیل کی بلند پروازی کا بہترین نمونہ بن جاتا ہے۔

''غبار شب'' ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔اس کا موضوع بھی جھام پور کی جاگیردارانہ تہذیب کی اتھل پتھل کا بیان ہے۔ ناول کا مرکزی کردار جاگیردار جمیل ہے جو بلا تفریق مذہب وملت، رنگ ونسل کے سب سے یکساں محبت اور پریم کرتا ہے۔سب کے حقوق کی رعایت اس کی عادت ہے لیکن چودھری اقبال نرائن اور عنایت خان نفرت، عداوت، منافقت اور مذہبی تعصب کا ایسا زہر گھولتے ہیں کہ اس سے پورے جھام پور کی فضا آلودہ ہوجاتی ہے ۔اس ناول میں بھی قاضی عبدالستار کے تجربے اور تخیل کا حسین امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔ان کے تخیل کی بلندی نے ماضی اور حال کو ایک دوسرے میں اس طرح پیوست کر دیا ہے کہ سارا منظر نگاہوں کے سامنے متحرک ہوجاتا ہے۔قاضی عبدالستار کے ناولوں میں اودھ کی عکاسی کے حوالے سے پروفیسر صغر افراہیم اپنے مضمون 'ایک افسانوی کردار: قاضی عبدالستار' میں لکھتے ہیں:

''پہلا اور آخری خط''، ''بادل''، ''مجو بھیا'' اور ''شب گزیدہ'' جیسے سماجی ناولوں میں مشترکہ تہذیبی قدریں، ماضی سے لامتناہی جذباتی لگاؤ، مٹتی جاگیر دارانہ تہذیب، دیہات کے طبقہ امراء کے حالات زندگی، اودھ کے آس پاس کی ثقافتی فضا اور طبقہ اعلیٰ کی شکست خوردگی کا احاطہ کیا گیا ہے۔''

''نیا قانون'' قاضی عبدالستار کا ایک اہم افسانہ ہے ۔اس میں انگریزوں کے ظلم وستم اور بڑھتے ہوئے تسلط کو موضوع بنایا گیا ہے۔مغل سلطنت کی بنیادیں کمزور ہونے لگی تھیں۔کمپنی بہادر کا اثر ورسوخ دھیرے دھیرے بڑھتا جارہا تھا اور لکھنؤ کی وہ تہذیب جو برسوں سے اپنی مضبوط اور توانا روایت کے لیے مشہور تھی ، رفتہ رفتہ زوال کی طرف بڑھتی جارہی تھی ۔کہانی میں اٹھارہویں صدی کے اختتامی ادوار کا بیان ہے جب بکسر کی جنگ میں کمپنی بہادر کی فوجوں نے اودھ کے نوابوں کو شکست دے کر اپنا قبضہ جمانا شروع کر دیا تھا۔دیکھیں اقتباس:

"ریزیڈینسی، نواب ریزیڈنٹ بہادر کی کوٹھی کے بجائے انگریزوں کی چھاؤنی معلوم ہورہی تھی۔ تمام برجوں اور فرازوں پر توپیں چڑھی ہوئی تھیں۔ راؤٹیوں اور گمزیوں کا پورا جنگل لہلہا رہا تھا۔ حصار پر انگریز سواروں اور پیدلوں کا ہجوم تھا۔ دونوں پھاٹکوں کے دونوں دروں پر بندوقیں تنی ہوئی تھیں۔"

افسانے میں ایک مقام پر شیر اور گھوڑے کی لڑائی کو جس ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا ہے اس سے قاضی عبدالستار کی انفرادیت اور ادبی شان واضح ہوتی ہے۔ واقعات کو ڈرامائی شکل دے کر افسانہ نگار نے پورے منظر کو متحرک بنا دیا ہے اور قاری گویا پورا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ بات کو ڈرامئی شکل میں پیش کرنے کا ہنر قاضی عبدالستار کو اچھی طرح آتا ہے ۔دیکھیں یہ اقتباس:

"دروازہ کھلتے ہی ایک غیر معمولی طور پر سفید اور اونچا اور بھاری گھوڑا انتہائی غضب ناکی سے ہنہناتا ہوا داخل ہوا۔ کبھی ہاتھوں سے زمین کھرچتا، کبھی پیروں پر کھڑا ہوکر پورے جسم سے تڑپتا۔ اس کی کنوتیوں سے چنگاریاں اور تھنوں سے شعلے نکل رہے تھے، اور اس کی جولانیوں کی مار سے پورا کٹہرہ ہل رہا تھا۔ ادھر جنوبی دروازہ بھی کھل گیا اور دوسرے چھکڑے سے ایک شیر اندر داخل ہوا۔ گرجتا ہوا دہاڑتا کٹہرے کے وسط تک جا کر تھما۔ ساتھ ہی یکساں آوازوں کا ایک مشت گولہ اس پر گر پڑا اور رستے ہوئے بدن سے اڑ کر گھوڑے پر گرا۔ گھوڑے نے پوری مشاقی سے اپنے اگلے بدن کو سمیٹ کر اتنا کاری وار کیا کہ شیر کا چہرہ بگڑ گیا۔ پورا کٹہرہ اس عجیب وغریب اور بھیاونی لڑائی سے اتھل پتھل تھا اور گرد وباد کے بادلوں میں ڈوبتے اور ابھر تے جانور ایک دوسرے کی قضا کی طرح ایک دوسرے پر مسلط تھے کہ ہزاروں آنکھوں کے سامنے شیر نے پیٹھ دکھائی اور اپنے چھکڑے سے پناہ مانگی۔"

مذکورہ اقتباس نہ صرف گھوڑے اور شیر کی لڑائی کا دلچسپ منظر پیش کرتا ہے بلکہ اس سے اودھ کی مخصوص تہذیب اور اس عہد کی زوال پذیر نوابی حکومت کا پورا نقشہ بھی سامنے آجاتا ہے۔ ساتھ ہی بدلتے ہوئے سیاسی حالات سے بھی قاری کو گہری واقفیت حاصل ہوجاتی ہے۔ اس افسانے میں قاضی عبدالستار نے تاریخ کے ایک نازک دور اور بدلتے ہوئے حالات کی کامیاب ترجمانی کی ہے۔

'پیتل کا گھنٹہ' قاضی عبدالستار کا سب سے مشہور اور کامیاب افسانہ ہے جو انھوں نے ۱۹۴۶ء میں لکھا۔ اس افسانے میں انھوں نے اودھ کے علاقہ بھسول کی مخصوص طرز معاشرت، بدلتی ہوئی تہذیبی صورت حال اور جاگیردارانہ نظام کے زوال کو بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔ اس طرح یہ افسانہ تاریخی اہمیت کا حامل بن جاتا ہے۔ راوی، دیہاتی، قاضی انعام حسین، ان کی اہلیہ، تانگہ بان اور شاہ جی افسانے کے کردار ہیں لیکن مرکزی حیثیت بھسول کے تعلقہ دار کو حاصل ہے جو شروع سے آخر تک ہر جگہ کہانی میں موجود ہے۔ کہانی میں راوی کی موجودگی بھی نمایاں کردار ادا کرتی ہے۔ کہانی میں پیتل کا گھنٹہ کو علامتی حیثیت حاصل ہے۔ راوی کو پیتل کا گھنٹہ سے صرف دو جگہ واسطہ پڑتا ہے۔ اول انعام حسین کے یہاں۔ دوم اپنے گھر واپس جاتے وقت۔ دیکھیں سابقہ اول کی تصویر:

"وہاں دیوار سے لگا، اچھی خاصی سینی کے برابر پیتل کا گھنٹہ کھڑا تھا۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ گھنٹے میں مونگریوں کی مار سے داغ پڑ گئے تھے۔ دوانگل کا حاشیہ چھوڑ کر جو سوراخ تھا اس میں سوت کی کالی رسی بندھی تھی۔ اس سوراخ کے برابر ایک بڑا سا چاند تھا۔ اس

کے اوپر اسات پہلو کا ستارہ تھا۔ میں نے تولیہ کے کونے سے جھاڑ کر دیکھا تو وہ چاند تارا بھسول اسٹیٹ کا مونوگرام تھا۔ عربی رسم الخط میں قاضی انعام حسین آف بھسول اس ٹیٹ (اودھ) کھدا ہوا تھا۔ یہی وہ گھنٹہ تھا جو بھسول کی ڈیوڑھی پر اعلان ریاست کے طور پر تقریباً ایک صدی سے بجتا چلا آرہا تھا۔ میں نے اسے روشنی میں دیکھنے کے لیے اٹھانا چاہا لیکن ایک ہاتھ سے نہ اٹھا سکا۔ دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر دیکھتا رہا۔''

کہانی کی بنت اور تراش خراش میں کہانی کار نے بڑی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ کہانی کا پلاٹ اس بات پر شاہد ہے کہ افسانہ نگار فکشن کے رموز و اسرار سے اچھی طرح واقف ہے۔ اس لیے جلد ہی قاری اس کا ہمنوا بن جاتا ہے اور پوری کہانی اودھ کی تہذیب وثقافت کی بھرپور عکاسی کرنے لگتی ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر صغیر افراہیم کی یہ رائے بہت اہم ہے:

''کہانی کی بنت میں پیتل کا گھنٹہ اور راوی کی حیثیت ثانوی ہو جاتی ہے اور مرکزیت حاصل ہوتی ہے قاضی انعام حسین کو اور پھر ان کے توسط سے جاگیردارانہ عہد کے زوال کے المیہ کو۔ اودھ کی تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی صداقت کو انھوں نے واقعات کے باہمی انضباط اور مضبوط پلاٹ کے پیکر میں اس طرح سمو دیا ہے کہ قاری کہیں بھی ذہنی انتشار میں مبتلا نہیں ہوتا ہے۔ زمینداری کے خاتمہ کے بعد اودھ کے کدا ترس جاگیرداروں کا جو عبرتناک حال ہوا، یہ افسانہ اس کی بھرپور نشاندہی کرتا ہے۔'' (قاضی عبدالستار کی افسانہ نگاری اور 'پیتل کا گھنٹہ کا تجزیاتی مطالعہ، پروفیسر صغیر افراہیم)

کہانی کا آغاز صیغہ واحد متکلم سے اس طرح ہوتا ہے:

''آٹھویں مرتبہ ہم مسافروں نے لاری کو دھکا دیا اور ڈھکیلتے ہوئے خاصی دور تک چلے گئے لیکن انجن گنگنایا تک نہیں۔''

کہانی کا مرکزی کردار انعام حسین ہیں مگر یہ کہانی صرف ان کے عروج وزوال کی داستان نہیں بلکہ اس میں آزادی سے قبل اور بعد کے ہندوستان کی سماجی، معاشرتی اور سیاسی جہات کو فنکارانہ ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے۔ اس لئے انعام حسین کا کردار کہانی کے منظرنامے پر ہر جگہ بدلتے ہوئے حالات کے تناظر میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔ شاہ جی کا کردار دیہی زندگی کی معیشت میں بدلاؤ اور تانگہ بان کا کردار مستقبل کی نئی راہوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ دیکھیں اقتباس:

''سامنے وہ شاندار مسجد کھڑی تھی، جسے قاضی انعام حسین نے اپنی جوانی میں بنوایا تھا۔ مسجد کے سامنے میدان کے دونوں طرف ٹوٹے پھوٹے مکان کا سلسلہ تھا، جن میں شاید کبھی بھسول کے جانور رہتے ہوں گے، ڈیوڑھی کے بالکل سامنے دو اونچے آم کے درخت ٹرافک کے سپاہی کی طرح چھتری لگائے کھڑے تھے۔ ان کے تنے جل گئے تھے۔ جگہ جگہ مٹی بھری تھی۔ ڈیوڑھی کے دونوں طرف عمارتوں کے بجائے عمارتوں کا ملبہ پڑا تھا۔ دن کے تین بجے تھے۔ وہاں اس وقت نہ کوئی آدم تھا نہ آدم زاد کہ ڈیوڑھی سے قاضی انعام حسین نکلے۔''

مذکورہ بیان سے بھسول کی پوری طرح ماضی اور حال کی صورت سامنے آجاتی ہے۔ اس بات کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے کہ جاگیردارانہ نظام کے خاتمے کے ساتھ بہت کچھ ختم ہو گیا ہے۔ اودھ کی مخصوص طرز معاشرت، مہمان نوازی اور رہن سہن کے سارے نقوش سامنے آجاتے ہیں کہ کس طرح

مہمان کی خاطر پیتل کے گھنٹے کو بھی بیچ دیا جاتا ہے۔ انداز بیان پرسوز ہے جس میں فنی حسن اور تاثیر بھی ہے۔

فن پارے میں زبان و بیان کی اہمیت سے کسی کو انکار کی گنجائش نہیں۔ افسانے کی زبان قاری کی فہم سے پرے ہو تو کہانی اپنا تاثر کھو بیٹھتی ہے۔ قاضی عبد الستار کے سبھی افسانوں میں زبان واقعات و کردار اور موضوع سے پوری طرح ہم آہنگ ہوتی ہے۔ انھوں نے زبان و بیان دونوں سطحوں پر اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہے۔ افسانہ کی فکری و فنی خوبیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے پروفیسر صغیر افراہیم لکھتے ہیں:

> ''اس افسانے میں موضوع کی وسعت، فکر کی بلندی، تجربے کی گہرائی، مشاہدے کی گیرائی، تاریخی اور تہذیبی شعور اور فن کی پختہ کاری ہے ار پھر فنکار کی مخصوص ہنرمندی نے اس کے ڈھانچے میں زندگی بھر دی ہے۔ اسی لیے ''پیتل کا گھنٹہ'' نہ صرف ایک مخصوص تہذیب میں اقدار کی شکست کا المیہ ہے بلکہ یہ افسانہ ایک نئے نظام کی نمود، بدلتے ہوئے حالات سے پیدا شدہ بے اطمنانی اور ماضی کی بازیافت کا ترجمان ہے۔'' (قاضی عبدالستار کی افسانہ نگاری اور 'پیتل کا گھنٹہ کا تجزیاتی مطالعہ، پروفیسر صغیر افراہیم)

مختصر یہ کہ قاضی عبدالستار نے اودھ کی زوال آمادہ تہذیب کی عکاسی، دیہاتوں کی تصویر کشی اور جاگیردارانہ نظام کے زوال کو اپنے فکشن میں مکمل فنکارانہ مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے اسلوب کی دلکشی اور تازگی نے ان کے فن پاروں کی معاشرہ نگاری اور تہذیبی عکاسی کو مؤثر بنا دیا ہے۔ ان کے یہاں حقیقت پسندانہ شعور کے ساتھ گہری سماجی بصیرت بھی ہے۔ زبان اور انداز بیان کی لچک ان کے فکشن کو پر لطف بنا دیتی ہے۔ انھوں نے تشبیہوں، استعاروں اور محاوروں بالخصوص علاقہ اودھ کی بولیوں کے فقروں سے اپنے فن پاروں کو تازگی عطا کی ہے۔ ان کے کردار ماحول اور معاشرے کے سچے ترجمان ہوتے ہیں۔ ان کے فکشن میں تجربے اور تخیل کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ انھوں نے تصنع، بے جا مبالغہ آرائی، لفاظی اور ادق الفاظ و محاورات سے ہمیشہ گریز کیا ہے۔ ان تمام حقائق کی بنیاد پر ہم کہ سکتے ہیں کہ قاضی عبد الستار کے ناول اور افسانے ایک خاص فکر، مخصوص تہذیب اور منفرد اسلوب کے حامل نظر آتے ہیں۔

**ڈاکٹر عبدالحنان رھبر**۔ مبارکپور اعظم گڑھ

# غزل

ہو گئی جیسے درندوں کی حکومت ہر طرف
دیکھتا ہوں میں رذیلوں کی رذالت ہر طرف

پھر کوئی بہروپیا آیا ہے میرے شہر میں
گھومتا ہے لیکے جھوٹی شکل وصورت ہر طرف

جانے کیسا رنگ آیا زندگی کے رنگ میں
ہو گیا بے رنگ سا رنگ شرافت ہر طرف

ان دنوں ظلم وستم کی آندھیوں کے زور سے
لڑ رہی ہے موت سے مظلوم جرات ہر طرف

ہے کدھر انصاف کی دیوی مرے منصف بتا
گونگی بہری بن گئی تیری عدالت ہر طرف

دل کی سوئی جراتیں بیدار اب ہونے لگیں
ہے نمایاں انقلابوں کی علامت ہر طرف

پھر اسی رنگ سحر کا حسن آئے گا نظر
جب اذاں دیگی رخ جاناں کی طلعت ہر طرف

# تقدیر میں ہو تو...

موبائل کی بیپ ہوتے ہی سنایا نے جھنجھلا کر اپنی آنکھیں کھولی۔کسی انجان نمبر سے کال تھا۔

'ہیلو'اس نے قدرے ناگواری سے فون رسیو کیا۔

میڈم میں ای،ڈی،ای انشورنس کمپنی سے بول رہی ہوں۔کیا آپ کو'......دوسری جانب کی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ سنایا نے فون کاٹ دیا۔

'اف یہ مارکیٹنگ والے بھی نا'...... اس نے پھر سے آنکھیں موند لی اور فون تکیے پر رکھدیا۔

اس نے واپس فون لیکر وقت دیکھا'......ہائے!چھ بج گئے۔اب اس نے وہاٹساپ دیکھا پھر فیس بک میسنجر کھولا۔

شہر میں کرونا وائرس کی وجہ سے تمام تعلیمی ادارے بند تھے۔سارا دن وہ اپنی عزیز ترین دوست عروج کے ساتھ وہاٹساپ اور فیس بک پر لگی رہتی۔

سنایا کا فیس بک یوزر نیم 'لولی پری' تھا اور عروج کا اسکرین نیم تھا 'اینجل عروج'۔ دونوں نے یہ آئی ڈی بہت ہی جوش وخروش کے ساتھ بنایا تھا،جب وہ دسویں کلاس کی طالبہ تھیں۔وہ پرانی باتوں کو یاد کر رہی تھی اتنے میں اسے کسی لڑکے کا میسج آیا۔

'ہیلو'اسکرین نیم تھا 'دانش احمد'۔

'ہائے' اس نے کافی دیر کے بعد جواب دیا۔کسی انجان لڑکے سے بات کرنا اسے مناسب نہیں لگا،پھر خیال آیا کی ذرا اپنی دوست عروج کے ساتھ ملکر کچھ وقت گزاری کرتے ہیں۔

'کیا میں آپ کا نام جان سکتا ہوں'۔

'میرا نام ہے سنایا نور ہے۔'اس نے جواب بھیجا۔

'مس سنایا آپ کرتی کیا ہیں؟ اور کدھر سے ہیں آپ؟'۔

وہ اب اپنا اکاؤنٹ بند کرنے والی ہی تھی کی اسے سوال کے ساتھ فرینڈ ریکویسٹ موصول ہوئی تھی۔اس نے دانش کو ایڈ کرلیا کہ بعد میں بلاک کر دیگی۔

'جی میں یم،ایس،سی فائنل ایئر کی اسٹوڈنٹ ہوں اور حیدرآباد میں رہتی ہوں، وہ جواب دیکر لاگ آوٹ کرنا چاہتی تھی۔

'سب وہ ہی کیوں پوچھے ،مجھے بھی سوال کرنا چاہیے، اس کی موٹی عقل نے کہا اور اس نے تیزی سے اپنی انگلیاں چلائی۔

'ویسے مسٹر دانش! آپ کیا کرتے ہیں اور کدھر کے رہنے والے ہیں؟'۔

'میں بھی حیدرآباد سے ہوں، پر پڑھائی کی وجہ سے ممبئی میں رہتا ہوں کالیج ہوسٹل میں، فی الحال میں حیدرآباد میں ہی ہوں اپنے گھر'۔ بہت ہی تفصیل سے جواب آیا تھا۔دونوں نے ہی اپنی پروفائل پر کچھ نہیں لکھا ہوا تھا۔

'او،کے'۔اس نے اتنا کہنے پر ہی اکتفاء کیا تھا۔

کین آئی سی یو؟ دانش نے عجیب سوال کیا۔

ہیں!وہ ایک دم چونک گئی۔عجیب شخص ہے۔

جی نہیں،اس نے میسج کیا۔

کوئی بات نہیں، سنایا کو ہنسی آ گئی۔عجیب لوگ ہوتے ہیں دنیا میں۔عروج کو بتاؤنگی، اس کے بارے میں۔اسے پھر عروج یاد آ گئی۔

کیا ہم چیٹ میں رہ سکتے ہیں، دانش نے اپنا موبائل نمبر بھی میسج کیا۔

کیا مجھے بھی اپنا نمبر دینا چاہیے وہ نمبر ٹائپ کرنے کے بعد سوچ میں پڑھ گئی۔اتنا اتاولا کیوں ہو رہا ہے؟ وہ مسکرانے لگی۔

وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کے نمبر سینڈ کرے یا نہیں اتنے میں اسے ممی کی آواز آ گئی۔سنایا اگر اٹھ گئی ہو تو کچن میں آ جاؤ، وہ ایک دم گھبرا گئی اور اگلے ہی لمحے اس کی شہادت کی انگلی سے ''سینڈ'' کا بٹن پریس ہو گیا۔

آہ! یہ کیا ہو گیا، اس نے اپنے کھلے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

سنایا بیٹا کیا ہوا؟۔ممی نے پھر آواز دی۔

آ رہی ہوں ممی، اس نے جلدی سے اکاؤنٹ بند کیا اور کچن کی طرف چلی گئی' . کیا ہوا اتنی دیر تک سوگی؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نہ؟ ممی نے اس کے پھیکا پڑتا چہرا دیکھتے ہی سوال کیا۔

تھوڑا ٹمپریچر ہے شاید۔اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا اور ان کی مدد کرنے لگ گئی۔

موسم ٹھیک نہیں ہے یاد سے دوا کھا لینا' ممی نے کہا۔

جی! اس نے سر اثبات میں ہلا دیا پر ذہن الجھا ہوا تھا کہ کسی انجانے کو اپنا موبائل نمبر جو دیدیا تھا۔

رات کے کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آئی اور واپس اپنا اکاؤنٹ کھول کر اس لڑکے کا نمبر اپنے سیل میں فیڈ کر لیا۔اگر کال کرے تو پتا تو چلے گا، اتنے میں چھوٹی بہن ثانیہ اندر آ گئی اس نے لیپ ٹاپ بہن کے حوالے کیا اور خود بیڈ پر ڈھیر ہو گئی۔

آج عروج آئی ہوئی تھیں۔سنایا کے پاس بیٹھی وہ ہلکی پھلکی باتیں کر رہی تھی۔

''عروج، تم سے ایک بات کہنی تھی''۔

''ہاں بولو'' وہ لوازمات سے انصاف کرتے ہوئے لاپروائی سے بولی۔

سنایا نے اسے اپنے آن لائن دوست کے بارے میں بتا دیا۔ساتھ میں یہ بھی بتا دیا کی اس نے اپنا موبائل نمبر ایک انجانے شخص کو دیدیا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہے؟" ناشتہ کرتی عروج کے ہاتھ ایک دم رک گے۔

"اب گھورنا بند کر، سب ... سب تیری وجہ سے ہوا" وہ اس کی طرف دیکھے بنا کہہ رہی تھی۔

"اس میں میری غلطی کیسے ہوئی؟" وہ اور حیران ہو گئی۔

"اور نہیں تو کیا میں نے سوچا کے دونوں ملکر اس لڑکے کو ستائینگے ... اور آدھی غلطی ممی کی ہے، اچانک ہی مجھے آوازیں دینے لگی۔بندہ گھبراہٹ میں کیا کرتا ہے اسے خود ہی پتا نہیں چلتا". وہ دونوں کو قصوروار ٹہرا رہی تھی۔

"اچھا جی! میں آواز دیتی ہوں آنٹی کو ذرا اپنا غصہ ان پر بھی نکال لے۔

''ہائے! عروج ایسا مت بول، اب بتا نہ کیا کروں؟" وہ بیچارگی سے اسے دیکھنے لگی۔

"اس لڑکے نے فون کیا؟" وہ پھر سے مزے لیکر کھانے کی طرف متوجہ ہو گی۔

"نہیں" سنایا نے کہا۔

"ہوں فکر مت کر اگر فون کرے تو کہہ دینا کی تجھے اس سے بات کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں۔نمبر بلاک کر یگی تو وہ لڑکا کوئی نے نمبر سے کال کریگا۔ذرا سختی سے کہہ دینا کی دوبارہ

تجھے فون نہ کرے۔وہ جاتے ہوئے اسے نصیحت کرگئی۔

کچھ روز کے بعد شام کے وقت وہ یوں ہی لیٹی تھی کی اس کا سیل بجنے لگا .ہاتھ میں لیکر دیکھا تو 'دیبا،کا نام اسکرین پر جگمگا رہا تھا۔وہ اٹھی اور روم کر دروازہ اندر سے لاک کرنے لگی۔اس نے دانش کا نمبر دیبا کے نام سے سیو کیا تھ۔

"ہیلو"اس نے یس کا بٹن دبایا۔

" کیا میں سنایا نور سے بات کرسکتا ہوں؟ میرا نام دانش احمد ہے۔وہ بہت ہی اعتماد سے بات کررہا تھا۔

"جی میں سنایا ہی بول رہی ہوں". اس نے مدھم لہجے میں کہا۔

"اہ!اس دن کے بادآپ آن لائن ہی نہیں آئیں؟ میں تو ہر روز انتظار کرتا رہا۔کال کرنا مناسب نہیں لگ رہا تھا۔پھر میں نے سوچا حرج ہی کیا ہے،کوئی اور راستہ بھی تو نہیں تھانا". وہ تو یوں بات کررہا تھا مانو برسوں سے اسے جانتا ہو۔

وہ سدا کی ڈرپوک اسے بات کرنا اور یہ کہنا کی دوبارہ کال نہ کرے بہت مشکل لگ رہا تھا" .جی میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی". اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کی اسے کیسے بات کرے۔

"اب کیسی ہیں آپ؟ دوا تو لیتی ہیں نہ آپ؟" لہجہ فکرمند تھا۔

"میں ٹھیک ہوں" کہ کر وہ خود کو کوس رہی تھی کی ایک اجنبی کو نمبر دینے کی کیا ضرورت تھی۔

" ٹھیک ہے سنایا میں کل فون کرتا ہوں،خیال رکھیں اپنا". کہنے کے ساتھ ہی اس نے فون بند کردیا۔سنایا نے بھی فیصلہ کرلیا کیہ دوبارہ کال کریگا تو وہ ڈریگی نہیں اور اس سلسلے کو یہیں ختم کردیگی۔

دوسرے دن اس نے عروج کے گھر کا رخ کیا اور اسے دانش سے ہونے والی گفتگو سنائی اور عروج نے اپنا سر پیٹ لیا" .بول نہیں سکتی تھی جو میں نے بولنے کو کہا تھا؟"۔

"وہ اتنے اعتماد سے بات کررہا تھا کی میں ڈرگئی". اس نے وضاحت دی۔

"اب تو تیرے پاس ایک ہی راستہ ہے ...اپنا نمبر بدل دے۔اچھا ہوا وہ اٹساپ اس نمبر پر نہیں ہے."۔

"یہ ہی تو نہیں کرسکتی،گھر میں دس سوال کرینگے کیا کہونگی؟" کہنے کے ساتھ ہی وہ رونے لگی۔

"دیکھ تیری ایک یہ ہی عادت ہے جو مجھے اچھی نہیں لگتی .بات بے بات رونے لگتی ہے". عروج چڑھ گئی۔

سنایا نے جلدی سے آنسوں صاف کے اور پوچھنے لگی" .پھر کیا کروں؟"۔

"تو ڈرمت اور سختی سے کہ دے کی تجھے اس سے بات کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں".

اس نے پھر پرانا راستہ بتایا۔

شام کو اس نے پھر فون کیا۔وہ سوال پوچھتا اور سنایا جواب دیتی،خود سے اس نے کچھ نہیں کہا۔

"مجھے لگتا ہے جیسے آپ گھبرا رہی ہیں". وہ جیسے سب جانتا تھا۔

"جی ..جی ... نہیں تو میں کیوں گھبراونگی".

"ویسے آپ آن لائن کیوں نہیں آتیں". اس نے مدّعا بیان کیا۔

"میں اپنا وہ اکاؤنٹ یوز نہیں کرتی۔میں نے اس دن پورے ایک سال بعد وہ اکاؤنٹ کھولا تھا۔میں چیٹنگ نہیں کرتی". وہ جیسے اسی سوال کی منتظر تھی۔

"بہت اچھی بات ہے کی آپ چیٹنگ نہیں کرتیں".

کیا وہ اسے سراہ رہا تھا؟

"اور میں نے اپنا نمبر بھی غلطی سے دیا تھا آپ کو".

اس نے موقع دیکھ کر کہہ دیا۔
"او، کے۔میں پھر کال کرتا ہوں". وہ جیسے اسے آگے کچھ بولنے نہیں دینا چاہتا تھا۔اس کی بات سنی ان سنی کرکے اس نے کال ڈسکنیکٹ کر دیا اور ادھر وہ اپنا سر پیٹ کر رہ گئی، کچھ دیر بعد عروج کا فون آیا۔
"لاک ڈاؤن ختم ہو چکا ہے کل سے کالیج شروع ہو رہا ہے۔یہی بتانے کے لیے کال کیا تھا"۔
"اچھا ... تو پھر کل ملتے ہیں". سنایا نے فون بند کر دیا۔
وہ روز ہی سنایا کو کال کرتا اور حال چال پوچھ کر فون رکھ دیتا۔یوں ہی کتنے دن گزر گئے۔
"ہوں! تو لڑکا شریف لگتا ہے". کئی دنوں بعد بھی جب اس نے سنایا سے کوئی ایسی ویسی بات نہیں کی تو عروج کچھ نتیجے پر پہنچ کر کہنے لگی، اتنے میں اس کے فون پر میسج کی بیپ ہوئی۔
'' میں آج ممبئی جا رہا ہوں، اپنا خیال رکھنا . . . دانش".
"فکر مت کرو، ہاں جاتے ہی بھول جائے گا۔یہ لڑکے ایسے ہی ہوتے ہیں". عروج ہر وقت اپنی رائے لئے تیار رہتی تھی۔سنایا نے سر ہلا دیا۔
رات کے دس بج رہے تھے۔آج پورے تین دن ہو گئے، تھے اس کا کال نہیں آیا تھا۔وہ یوں ہی بے چین سی اپنی کتابیں پھیلائے بیٹھی تھی کی اس کا فون بج اٹھا .. وہ ایک دم کھل اٹھی ،اسے جیسے یقین تھا کی اسی کا نمبر ہوگا۔ممی اور ثانیہ ٹی، وی دیکھ رہیں تھیں، اس نے جلدی سے یس کا بٹن دبا دیا۔
"السلام علیکم ... سنایا میں دانش بول رہا ہوں".
وہی رواب دار آواز۔
" کیسے ہیں آپ؟ آپ کا کالیج شروع ہو گیا؟" سنایا نے پہلی بار کوئی سوال کیا تھا۔
"ارے کالیج تو ایک ہفتہ پہلے ہی شروع ہو گیا تھا، میں نے ہی چھٹی کر لی تھی".
"میں نے یہ بھی پوچھا کی آپ کیسے ہیں".
" آہ! تو اب ہماری بھی کوئی خیریت پوچھنے والا ہے ... میں بالکل ٹھیک ہوں"اس کے انداز پر سنایا چپ ہو گئی۔
"اچھا یہ بتاؤ کی تم سوتی کب ہو". دانش نے خاموشی توڑی۔
" آج کل کالیج کا بہت کام ہوتا ہے تو دیر سے ہی سوتی ہوں".
"امتحان کو تو ابھی کافی وقت ہے نا؟" ایسا پہلی بار ہوا تھا جو وہ اتنی تفصیل سے بات کر رہے تھے۔
"ہاں لیکن لاک ڈاؤن کی وجہ سے پڑھائی کا کافی نقصان ہوا ہے، اس لیے شیڈول بہت سخت ہو گیا ہے، ابھی محنت کرینگے تو آگے مشکل نہیں ہوگی". اس نے تفصیل سے کہا۔
''ویسے بھی مجھے اکیلے میں پڑھنے کی عادت ہے۔ثانیہ شام سات بجے سے ٹی وی دیکھتی ہے تو میں اسی وقت پڑھائی کرتی ہوں". وہ پھر گویا ہوئی۔
"آپ کی فیملی کے بارے میں بتائینگی۔اف یو ڈونٹ مائنڈ".
" گھر پر ممی، پاپا اور جڑواں بھائی بہن ساحل اور ثانیہ ہوتے ہیں، دونوں ہی انٹر کر رہے ہیں، پاپا زیادہ باہر ہی ہوتے ہیں بزنس کے سلسلے سے".
"اچھا تو تمہارے جڑواں بھائی بہن ہیں"... اسے شاید تعجب ہوا۔
"ہاں اور آپ کی فیملی میں کون کون ہوتے ہیں؟" اب کی بار اس نے سوال کیا۔

"میرے گھر پر ممی ڈیڈی ہیں اور ایک چھوٹی بہن ہے جو فارمسی کر رہی ہے" .

"اوکے" سنایا نے سن کر کہا۔

"میں بعد میں کال کرتا ہوں". اس نے فون بند کر دیا۔

دن یوں ہی گزر رہے تھے ایک دن اس نے سنایا سے اصرار کیا کی وہ وہاٹساپ پر بات کرنا چاہتا ہے، اس میں حرج نہیں تھا لیکن اس نے جو خواہش کی تھی وہ اسے پریشان کر رہی تھی۔

"دیکھو سنایا صرف دو منٹ کے لئے اپنا کیم آن کرنا، میں وعدہ کرتا ہوں دوبارہ پھر کبھی یہ خواہش نہیں کرونگا". دانش اصرار کر رہا تھا۔

"پر دانش اگر گھر میں کسی کو پتا چل گیا تو بہت پریشانی ہوگی". اسے کچھ عجیب لگ رہا تھا۔

"صاف صاف کہو نہ کی تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں ہے وہ چڑھ گیا۔

"ایسی بات نہیں ہے"... انداز سمجھانے والا تھا، پر وہ اس کی سن کب رہا تھا۔

''ایسی ہی بات ہے''... کہہ کر وہ چپ ہو گیا، دونوں طرف خاموشی تھی، پھر اسی نے خاموشی توڑی.

"دیکھو صرف ایک بار ... میں قسم کھا کر کہتا ہوں دوبارہ نہیں کہونگا اور صرف دو منٹ کے لئے ہی آن کرنا اور تمہیں اسی بات کا ڈر ہے نا کی کہیں میں تمہاری تصویر ہی نہ بنالوں اپنے فون سے، بے فکر رہو میں صرف دیکھونگا"۔

سنایا کو اس کی بات ٹالنا بہت مشکل لگ رہا تھا، وہ بات ہی ایسی کر رہا تھا، اسے ماننا ہی پڑا۔

"بہت ضدی ہو دانش تم ... لیکن صرف دو منٹ کے لئے ہی اور تم بھی اپنا وعدہ یاد رکھنا". اپنی بات ختم کرتے ہوئے اس نے کال کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

یہ بات اس نے عروج سے چھپائی تھی" . وہ نہیں سمجھے گی الٹا مجھ سے لڑائی کریگی، دانش ایک شریف لڑکا ہے، اتنا تو میں اسے جان گئی ہوں". اس نے عروج کو بتانے سے گریز کیا۔

دوسرے دن اس نے کالیج سے چھٹی کر لی، ممی اپنے روم میں آرام کر رہیں تھیں، ثانیہ اور ساحل دونوں ہی کالیج میں تھے، پاپا آفس گئے تھے، پھر بھی اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔

"میں ویڈیو کال کرتی ہوں، پر تم اپنا وعدہ یاد رکھنا" اس نے کہا۔

"سنایا میں نے قسم کھائی ہے"... دانش نے کہنے کے ساتھ ایک سمائلی سینڈ کی۔

گلابی رنگت پر بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جو گھبراہٹ سے اور پھیل گئی تھیں، لمبی کھڑی ستواں ناک اور گلاب کی پنکھڑی جیسے ہونٹ، گہرے سیاہ بالوں کی لٹیں جھول کر چہرے پر آرہی تھیں اور وہ کچھ جھنجلا کر اپنی لٹوں کو کان کے پیچھے ٹھونستی بہت دلکش لگ رہی تھی، وہ جیسے پلکیں جھپکانا بھول گیا تھا، سنایا نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ ان دو منٹوں کا اختتام کیا۔

"دو منٹ ختم ہوئے". کہہ کر وہ مسکرائی، ادھر دانش بھی مسکرانے لگا، بھوری آنکھیں، سانولی رنگت اور ایک پھیکی سی مسکراہٹ لئے چست سفید ٹی شرٹ میں اس کا کسرتی بدن نمایاں ہو رہا تھا۔

اسکرین پر سے جب اس کا چہرہ غائب ہوا تو وہ جیسے ہوش میں آگیا۔

آج دانش کا فون نہیں آیا تھا، اس نے خود کال کیا۔

"دانش ... ایک بات پوچھوں؟"

"نہیں". انداز عجیب تھا۔

"وہاٹ؟" وہ چونکی۔

"ایک نہیں دو باتیں پوچھو". اس نے قہقہہ لگایا۔

"شٹ اپ" وہ غصّے سے لال ہوئی۔

"اب پوچھو بھی" اس نے بمشکل اپنی ہنسی روکی۔

"دانش ... جب تم ... ممبئی میں ہوتے ہو تو ... تمہارے گھر والے تمھیں بہت مس کرتے ہونگے نا؟" اس نے رک رک کر اپنا سوال مکمّل کیا۔

"ہاں ... بہت مس کرتے ہیں" کہہ کر وہ رکا اور پھر کچھ سوچ کر وہ گویا ہوا۔

"اور جانتی ہو مجھے مس کرنے والوں کی لسٹ میں ایک اور نام کا اضافہ ہوگیا".

"کس کا نام" سنایا کے منہ سے بیساختہ نکلا۔

"آپ کا نام" انداز بہت سنجیدہ تھا۔

"نہیں! میرا کیوں، ... میں نہیں مس کرتی آپ کو... میں کیوں مس کرنے لگی" وہ ایسے بات کر رہی تھی جیسے اپنی چوری پکڑی گئی۔

"ہائے! ایسا کہہ کر آپ نے تو میرا دل ہی توڑ دیا" انداز ڈرامائی تھا۔

"اچھا"... سنایا کو ہنسی آگئی اس کے انداز پر۔

"سنو کل رات کو میں ممبئی واپس جا رہا ہوں، دن میں بزی ہوں راستے سے فون کرونگا، پڑھائی کا حرج ہو رہا ہے بہت چھٹیاں کر لی میں نے، میں راستے سے فون کرونگا".

"ٹھیک ہے . میں انتظار کرونگی" فون بند کر کے وہ بیڈ پر لیٹ گئی۔

رات کے دو بج رہے تھے اور اس کا فون مسلسل وایبریٹ ہو رہا تھا، کتنی دیر بعد اس کا ہاتھ فون پر پڑا اور وہ ایک جھٹکے سے جاگ گئی، نیند سے بوجھل ہوتی آنکھیں اس نے بمشکل کھولیں اسکرین پر دانش کا نمبر جگمگا رہا تھا، وہ خود کو تقریباً ڈھکیلتے ہوئے بالکونی میں گئی کیونکی دوسرے بیڈ پر ثانیہ سو رہی تھی۔

"ہیلو" وہ غنودگی کے عالم میں تھی۔

"اف! کتنی دیر سے کال کر رہا ہوں جانتی ہو؟"

"میں سو گئی تھی" وہ آنکھیں مسلتے ہوئے کہنے لگی۔

"اچھا! پھر سے سو جاؤ". اسے ہنسی آگئی۔

"ٹھیک ہے". اسے نیند کے سوا کچھ اور نہیں سوجھ رہا تھا۔

"ارے لڑکی پہلے میرے سوال کا جواب تو دو". وہ فون بند کرنے ہی والی تھی کی وہ چیخ اٹھا۔

"کون سا سوال؟" وہ حیران ہوئی۔

"مجھے مس کروگی؟"

"پتا نہیں" اس کی نیند ایک دم ہی غائب ہوگئی۔

"بولو نہ سنایا" وہ اصرار کر رہا تھا۔

"تھوڑا مس کرونگی... شاید". بہت ہی مدھم لہجہ تھا۔

"چلو تھوڑا ہی سہی مس تو کروگی" وہ جیسے یہ ہی سننا چاہتا تھا۔

سنایا کے امتحان ہونے والے تھے، وہ اور عروج کمبائن اسٹڈی کرنے لگے تھے، اس نے دانش سے کہ دیا تھا کی امتحان کے لئے ایک مہینے سے بھی کم وقت رہ گیا ہے اور وہ اسے زیادہ بات نہیں کر سکتی۔ ایک رات وہ پڑھائی کر رہی تھی دانش کا میسج آگیا۔

"کل کال کرونگا . رات کو جلدی مت سونا".

"کس کا میسج ہے؟" عروج نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"دانش" کہہ کر وہ پھر کتابوں میں مصروف ہوگئی۔

"اسے زیادہ سر مت چڑھا" وہ اسے جانچتی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگی، جسکا سنایا نے نوٹس نہیں لیا۔

.....(بقیہ آئندہ ماہ)

**وزیر احمد مصباحی** (بانکا) شعبہ تحقیق: جامعہ اشرفیہ مبارک پور

# بوڑھے والدین، معمر افراد اور اسلامی تعلیمات

**(یہ بات ہمیں سمجھ لینی چاہیے کہ بوڑھے افراد کو بھی زندگی کو بھرپور طریقے سے جینے کا اتنا ہی حق ہے جتنا ہم سب کو)**

مذہب اسلام، وہ آفاقی اور صفاتِ وسعت و ہمہ گیری سے مزین مذہب ہے جس میں زندگی گزارنے کے تمام تر طریقے اور انسانی ضرورتوں کی تکمیل کی مکمل تفصیلات نظر آتی ہیں۔ایک انسان کو اپنی زندگی میں جس چیز کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور اس کی تکمیل میں جس چیز کی بھی حاجت ہوتی ہے، اس کی ساری حسنِ وضاحت شریعت اسلامیہ میں مرقوم ہیں۔ہاں! اگر آپ بھی ان حقیقتوں کا عرفان چاہتے ہیں تو پھر کتب و تاریخ کے صفحات پلٹنے پڑیں گے۔

آج ہمارے معاشرے میں رحم و کرم کی مثال بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔اپنے چھوٹوں پر رحم و کرم اور بزرگوں و معمر افراد سے کس خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرنا ہے؟ یہ ساری چیزیں بالکل مفقود ہوتی نظر آتی ہیں۔اس وقت اس قوم کا، جسے دوسروں کے ساتھ بھلائی اور رحم و کرم کی تلقین کی گئی ہو، اس بیماری میں جو جھنا واقعی قابل رحم ہے۔وہ کون سے اخلاقی انحطاط کے واقعات ہیں جو مسلم سماج و معاشرے میں دیکھنے کو نہیں ملتی ہیں۔

ابھی چند روز قبل ہی کی بات ہے۔ایک معمر شخص، جو اپنی بیساکھی کے سہارے کسی طرح زمین پر پاؤں رکھ پاتا ہے، اس کی آنکھ کی روشنی جواب دے گئی ہے، زبان میں دانت نہیں ہے، چہروں پر جھریوں کا قبضہ ہے، جسم سے متصل پھٹے پرانے لباس اپنی غریبی پہ ماتم کناں ہے اور اب انسانی اندازے کے مطابق اس کی زندگی کے گنے چنے چند ہی ایام باقی رہ گئے ہیں، ہانپتے کانپتے اور روتے بلکتے ایک صاحب کے پاس آتا ہے اور پھر اپنی داستان غم یکلخت بیان ہی کرتا چلا جاتا ہے، زبان بڑی مشکل سے یہ بیان کر پاتا ہے کہ:

> "میں نے دس دن سے کھانا نہیں کھایا ہے، میری بیٹی اور بیٹا کے ساتھ میرا پوتا تک بھی مجھے برا بھلا کہتا ہے، وہ مجھے قدم قدم پر طعنے دیا کرتے ہیں اور میری ضرورت تئیں فکر مند بھی نہیں رہتے ہیں _____ بھلا بتائیں! کیا میں نے ان سب کے لیے اپنی پوری زندگی اسی لیے وقف کر دی تھی کہ وہ میرا سہارا بننے کے بجائے بار بار طعنے دیا کریں"۔

متذکرہ بالا گفتگو کی روشنی ہم اس بات کا درست اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آج ہمارا اخلاقی اقدار اس قدر متعفن ہو چکا ہے۔یہ تو ایک مثال ہے، ورنہ تو اس کے علاوہ نہ جانے کتنی جگہیں ہیں اور کہاں کہاں لوگ اپنے بوڑھے والدین پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑتے ہوں گے اور انھیں Old House کا راستہ دکھاتے ہوں گے۔یقیناً آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سیرت نبوی ﷺ کی روشنی میں اس بیماری اور اخلاقی پسماندگی کا علاج کریں۔آپ سیرت رسول اکرم

ﷺ کا مطالعہ کریں تو یہ بات آپ پر ضرور واشگاف ہو جائے گی کہ آقا کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معمر اور ضعیف افراد کے ساتھ خوش اخلاقی کا حکم صادر فرمایا ہے۔ اس حوالے سے قرآن پاک کی آیات کریمہ بھی شاہد عدل ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ

''تم ان دونوں کو اف تک نہ کہو''۔

چہ جائے کہ آپ انھیں ماریں پیٹیں۔

فتح مکہ کا واقعہ ہے کہ آقا کریم ﷺ کی بارگاہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ دامن اسلام سے وابستہ کرانے کے لیے اپنے والد گرامی کو ساتھ لے کر حاضر ہوئے۔ یہ دیکھ کر آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

''تم اپنے بوڑھے باپ کو گھر میں ہی کیوں نہ رہنے دیا میں خود چل کر ان کے پاس آجاتا"۔

(مفہوماً، مسند احمد، رقم الحدیث ۲۸۰۰۱)

یہاں مقام غور ہے کہ ایک عظیم قائد جو شہر مکہ میں فاتحانہ شان وشوکت کے ساتھ داخل ہوا ہے۔ ان کی بارگاہ میں، ایک عمر رسیدہ شخص جو دس سال سے زائد عرصہ سے ان کے حکم کی نافرمانی کر رہا ہے، حاضر ہوتا ہے تو آپ اس کے ساتھ کس قدر رحم وکرم اور اخلاقی بلندی کا مظاہرہ فرماتے ہیں۔ کیا ہمارے لیے اس فعل میں درس عبرت نہیں ہے کہ ہم بھی اپنے آقا ﷺ کی پیروی کریں اور اپنے سے معمر اشخاص کے ساتھ حسن عمل کا مظاہرہ کریں۔ یقیناً ایک عمر رسیدہ شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی بقیہ زندگی مصائب وآلام اور مشقتوں سے دور ہوکر بالکل ہنسی خوشی کے ساتھ گزارے، وہ اپنے بال بچوں اور خویش و اقارب کی توجہات کا طالب ہوتا ہے۔ ہمیں یہ بات ضرور یاد رہنی چاہیے کہ بوڑھے افراد کو بھی زندگی کو بھرپور طریقے سے جینے کا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ ہم لوگوں کو۔ آقا کریم ﷺ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا کہ:

'جو چھوٹوں پر شفقت اور بڑوں کی تعظیم نہ کرے وہ ہمارے طریقے پر نہیں"۔

دراصل ایک موقع پر ایک عمر رسیدہ شخص آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر آیا تو وہاں مجلس میں موجود افراد نے ان کے لیے جگہ کشادہ نہیں کی، اس پر آپ ﷺ نے مذکورہ جملہ ارشاد فرما کر بڑوں کی تعظیم اور چھوٹوں پر شفقت فرمانے کا سنہرا درس دیا کہ یہ مومن کے اخلاق کا جزو لازم ہونا چاہیے۔ اسی طرح ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص آپ ﷺ کی بارگاہ میں ہجرت پر بیعت کرنے کے لیے آیا تو ان کے والدین رونے لگے، اس شخص نے جب اس معاملے سے آقا کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ فرمایا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

" گھر واپس جاؤ اور جس طرح تم نے اپنے والد کو رلایا ہے، انھیں ہنساؤ"۔

متذکرہ بالا تمام باتوں سے یہی مفہوم کشید ہوتا ہے کہ ہم اپنے والدین اور معاشرے کے بڑے بزرگوں کی تعظیم کریں، انھیں ہنسی خوشی زندگی گذارنے کے مواقع فراہم کریں، کوئی تکلیف نہ پہنچائیں، کبرسنی میں انھیں (Old House) پہنچا کر اور مہینہ دس دن میں ملاقات کر کے اپنے آپ کو ذمہ داری سے سبکدوش نہ جانیں۔ بلکہ انھیں گھر پہ ہی رکھیں، خوب خدمت کریں، ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھیں، دنیا ہی میں جنت کمائیں اور سب سے بڑی بات جو ہے وہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو نبی اکرم ﷺ کا فرمان بنا کر معاشرے میں ایک وفادار امتی ہونے کا ثبوت فراہم کریں تاکہ ہمارا گھر اور معاشرہ دونوں امن وآشتی کا گہوارہ بن جائیں۔ اللہ کریم توفیق خیر سے نوازے۔ (آمین یارب العالمین)

# سابق اردو ڈائریکٹر امتیاز کریمی کا BPSC کے رکن کی حیثیت سے تقرر

## ڈاکٹر محمد گوہر، ڈاکٹر مختار احمد فردین اور ڈاکٹر اے کے علوی نے دی مبارکباد

میں کہاں رکتا ہوں عرش و فرش کی آواز سے
مجھے جانا ہے بہت اونچا حد پرواز سے

کہتے ہیں کہ آپ کے اندر حوصلہ اور جذبۂ انسانیت اور ملت وقوم کی ترقی وخوشحالی کیلئے فکرمند ہیں تو اللہ سبحانہ وتعالی ایسے خدمت گزاروں کے خدمت کو اپنے خاص خدمت خلق کے لیے چن لیتے ہیں اور ہم نے دیکھا کہ

سابق ڈاریکٹر امتیاز کریمی صاحب اس قدر خلیق اور ملنسار شخصیت کے مالک ہیں اور ان کی خدمات قابلِ ستائش اور مبارکباد ہیں آپ جس شعبوں کی ذمہ داری سنبھالے آپ نے بہت ہی حسن وخوبی کے ساتھ کام کو انجام دیے ہیں۔

آپ کے انہی جذبوں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے آج ڈاکٹر محمد گوہر ایڈیٹر تاثیر، ڈاکٹر مختار احمد فردین، صدر آل انڈیا اردو ماس کمیونیکیشنل سوسائٹی فار پیس، حیدرآباد اور ماہرین تعلیم قومی ایوارڈ یافتہ ڈاکٹر اے کے علوی نے خصوصی مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ آپ کے اس تقرر سے ملت وقوم میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور ماضی ہی کیطرح آپ کے خدمات سے قوم کو فیض پہنچے گا، آپ کے اندر قدرت نے بھر پور ایڈمنسٹریشن صلاحیتوں سے نوازا اور حکومت بہار کے وزیر اعلی نتیش کمار جی کا بہت بہترین فیصلہ ہے اور اس فیصلہ اور آپکی نامزدگی کا خیر مقدم کرتے ہیں اور مبارکباد پیش کرتے ہیں چیف سکریٹری ایڈیسنل بہار، اقلیت بہبود عامر سبحانی صاحب کے خیر مقدم کیساتھ ڈاکٹر محمد گوہر، ڈاکٹر مختار احمد فردین اور ڈاکٹر اے کے علوی نے بھی اپنے اس پیغام میں نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ

بہار ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور ایسے میں ہمارے آج کی نسل کو چاہیے کہ بہترین تعلیم حاصل کرکے امتحان اور competitive examination کی تیاری کریں اور اس سلسلے کی کڑی کے طور پر مکمل رہبری اور رہنمائی ہمارے قابلِ احترام وقدر شخصیات عامر سبحانی صاحب اور امتیاز کریمی صاحب کے خدمات اور نوجوان اپنے لیے انکے خدمات کو رول ماڈل بنائیں اور آپ انہی کی طرح ملت وقوم کے خدمات انجام دینے کا عزم کریں انشاء اللہ ایک دن ضرور کامیاب ہوں گے۔

ڈاکٹر مختار احمد فردین اور ڈاکٹر محمد گوہر ایڈیٹر تاثیر کا خصوصی مبارکباد دیتے ہوئے ماضی کے دنوں کی ملاقات اور اس خاص موقع پر آل انڈیا اردو ماس کمیونیکیشنل سوسائٹی فار پیس کی جانب سے امتیاز کریمی صاحب کے اردو خدمات کے اعتراف میں دفتر تاثیر میں اردو انمول رتن ایوارڈ سے سرفراز کیے گئے تھے اس موقع پر انٹرنیشنل سیمنار میں شرکت کو آیے ڈیلیگیٹ گواہ بنیں اور آپ امتیاز کریمی صاحب نے بہت سادگی کے ساتھ قبول کرتے ہوئے کہا کہ

آپ سبھوں کے اس جذبے کو سلام کرتا ہوں اور آج کی اس مختصر تقریب میں موجود سبھوں کا خاص کر ڈاکٹر محمد گوہر صاحب، ڈاکٹر مختار احمد فردین، حیدرآباد کے اس ایوارڈ اور تہنیت کی لیے بہت مشکور ہوں اور آپ امتیاز کریمی صاحب کے اس عزم و حوصلہ کو دیکھ کر آج کی نامزدگی سے پورا بہار اور ہندوستان، حیدرآباد، کلکتہ حلقۂ اردو میں خوشی کی لہر دیکھنے میں آئی ہے، بالخصوص سہسرام کے ماہرین تعلیم اور قومی ایوارڈ یافتہ ڈاکٹر اے کے علوی صاحب نے بھی خوشی کا اظہار فون پر کرتے ہوئے یہ خوشخبری سنایا، جبکہ یہ خبر حکومت بہار کی جانب سے ریلیز سے اردو دنیائے ادب و زبان تک پہنچ گئی تھی۔

امتیاز کریمی صاحب سابق اردو ڈائریکٹر کی حیثیت سے بہار کو پوری دنیا سے جوڑنے میں ایک مثال رکھتے ہیں خاص کر اردو کے ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، پروفیسروں، استادوں، ناقدوں، اور ماہرین اور محبان اردو کو connecting with the urdu personalities کے خدمات کے لئے پہچانے جائیں گے، خاص کر بھاسا سنگم سہ ماہی میں خصوصی نمبر شائع کرنا اور خراج عقیدت پیش کرتے کے لیے دنیا کے رائیٹرز کو شامل کرنا قابلِ ستائش اور خراج تحسین کے مستحق ہیں ۔امتیاز کریمی صاحب، ان کی خدمات اور کارناموں کو لفظوں میں احاطہ نہیں کر سکتے ہیں، اس لیے ڈاکٹر محمد گوہر، ڈاکٹر مختار احمد فردین اور ڈاکٹر اے کے علوی نے اپنے نیک خواہشات اور مبارکباد پیش کی اور امید ظاہر کی کہ آپ کے اس تقرر پر ملت وقوم کو فخر ہے اس لیے کہ آپ حیات و کائنات کو ساتھ لے کر چلنے والے قابلِ قدر شخصیت میں شمار ہوتا ہے۔


DR. S.J HUSSAIN
MD (Unani)
Former director Incharge
Central Research Institute Of Unani Medicine
Govt of India

website: www.unanicentre.com
Email:syedjalilhussain@gmail.com
jaleel_hussain@yahoo.com

Dr. Jaleel's

یونانی سینٹر فار کارڈیک کیر
UNANI CENTER FOR CARDIAC CARE

Consultation Time
Morning:11:00 am to 2:30 pm-Evening:7:00 pm to 9:30 pm
(Friday Morning and Sunday Evening Closed)

Cell:
+91 8142258088
+91 7093005707

Adress -: No: 8-1-332/3/B-69, RoadNo 1(A)Arvind Nagar Colony
Tolichowki Hyderabad - 500008 T.S India

مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم (اقامتی وغیر اقامتی ادارہ)

شاہی ہلز شاہین نگر حیدرآباد

زیر انتظام : شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد

Ac No: 1327104000065876 Bank Name: IDBI
AcN: SHIBLI INTERNATIONAL ADUCATIONAL AND CHARITABLE TRUST
IFS: IBkL0001327. Branch: Charminar Hyderabad (T.S)

بانی وناظم: مولانا ڈاکٹر مفتی محمد محامد ہلال اعظمی۔ موبائل: 9392533661